تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی کا علمی، ادبی، لسانی، فنی و سائنسی جریدہ

جلد03 | شمارہ 4 | ماہ اپریل 2018ء

ایڈیٹر

پروفیسر ایس۔اے۔شکور

ڈائرکٹر / سکریٹری تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی

خط وکتابت وترسیلِ زر کا پتہ: ماہنامہ قومی زبان، صدر دفتر تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی، چوتھی منزل، حج ہاؤز، نامپلی، حیدرآباد 500 001 تلنگانہ اسٹیٹ۔اِنڈیا

Edited, Printed and Published by Prof. S.A. Shukoor,

Owned by Telangana State Urdu Academy, Minorities Welfare Dept., Govt. of Telangana,

Printed at M/s. Taahaa Print Systems, Flat No. 304-B, Door No. 5-9-189, Lenaine Estate, Abids Hyderabad

Published from 4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad-500 001 Telangana State

Ph: No. 040-23237810 Fax: 040-66362931 **Email:** qaumizaban.tsua2015@gmail.com

ماہنامہ

قومی زبان

مدیر	:	پروفیسر ایس اے شکور، ناظم / معتمد تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی
ناشر و طابع	:	پروفیسر ایس اے شکور، ناظم / معتمد تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی
ترتیب و تزئین	:	محمد ارشد مبین زبیری
صورت گری	:	محمد جنید اللہ بیگ
سرورق	:	سید مجیب الدین
طباعت	:	طہٰ پرنٹ سسٹمس، عابڈس، حیدرآباد
ماہ	:	اپریل 2018ء
جلد	:	سوم
شمارہ	:	(4)
ترسیلِ اختیار	:	تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی
استحقاق	:	تمام حقوق تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی کی تحویل میں ہیں
مبادلہ ماہانہ	:	15-00 (پندرہ) روپے
مبادلہ سالانہ	:	150-00 (ایک سو پچاس) روپے

''قومی زبان'' میں شائع شدہ مضامین میں اظہار کردہ خیالات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

قرینہ

ہم کلامی	:	پروفیسر ایس اے شکور	6

مضامین:

اقبال اور حیدر آباد	:	پروفیسر محمد علی اثر	7
علامہ اقبال اور فرزندانِ اسلام	:	ڈاکٹر عقیل ہاشمی	20
فکر اقبال کا بنیادی مآخذ	:	ڈاکٹر قطب سرشار	28
اقبال کے فکر وفن کا گراف	:	ڈاکٹر رؤف خیر	34
دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر	:	ڈاکٹر اسلم فاروقی	41
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں	:	ڈاکٹر محمد ابرار الباقی	46
شاعر مشرق کی حیات ؛سنین کے آئینے میں	:	ڈاکٹر محمد انور الدین	50
کلام اقبال میں تقدیر کے چند مباحث	:	ڈاکٹر وصی اللہ بختیاری	61
اقبال اور عظمتِ انسانی	:	ڈاکٹر محمد ناظم علی	70
نظم عقل و دل ایک مطالعہ	:	سید محبوب قادری	75
کلامِ اقبال میں واقعہ کربلا کی عصری معنویت	:	ڈاکٹر نکہت جہاں	79
علامہ اقبال کا تصورِ حسن و عشق	:	محمد ارشد مبین زبیری	82
اقبال کا مردِ مومن	:	ڈاکٹر عظمت اللہ	85
علامہ اقبال اور عشق رسولؐ	:	اعجاز علی قریشی	87
شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ اور مغربی تہذیب	:	سیدہ عابدہ امۃ النعیم	92

oOo

ہم کلامی

حسب وعدہ ماہ اپریل 2018ء کا خصوصی شمارہ جسے ہم نے شاعر مشرق علامہ اقبال کے نام معنون کیا ہے' قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔اس خصوصی شمارے میں ممتاز ادیبوں' اسکالرس اور مضمون نگار اصحاب کے معیاری مضامین شائع کئے گئے ہیں۔امید ہے کہ ان مضامین کے ذریعہ قارئین کو علامہ اقبال کی زندگی' ان کے شعری ونثری کارناموں اور دیگر کوائف کے بارے میں مفید معلومات حاصل ہونگی۔

شاعر مشرق علامہ اقبال کی شخصیت' ان کے علمی' نثری وشعری کارنامے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔علامہ نے اپنی شاعری کے ذریعہ قوم اور ملت کو جہاں درس خودی دیا' حوصلہ و ہمت پیدا کی' وہیں خالق حقیقی سے سچی محبت کے ساتھ ساتھ وطن عزیز سے محبت کا بھی درس دیا۔ان کے شعری مجموعوں بانگ درا' بال جبریل' ضرب کلیم اور ارمغان حجاز کی غزلوں' نظموں' رباعیوں اور قطعات کے ذریعہ علامہ نے جہاں قوم کی بے حسی' بداعمالی اور سماج کی خرابیوں کا تذکرہ کیا ہے وہیں نوجوانوں کو ہمت دلائی ہے' انہیں غفلت ومایوسی کے اندھیروں سے نکالنے کی کوشش کی ہے' ان میں خودی' خدااعتمادی اور جدوجہد کے جذبات پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔انہوں نے شکوہ جواب شکوہ کے ذریعہ انسان کی عجز ونیازی' عبادات' نیک کاموں' بداعمالی' بے صبری' بے ثباتی' خدا سے دوری' احسان فراموشی اور دین سے بیزاری اور برائیوں کے تدارک کی تدابیر جیسے تمام واقعات کو یکجا کیا۔اقبالؔ نے نئی نسل کے حریت پسند نوجوانوں کو بصیرت اور وجدان صحیح پر اکسانے کا کام انجام دیا۔انہوں نے فرد کو ملت کے لئے اور ملت کو فرد کے لئے لازم وملزوم قرار دیا۔انہوں نے وقت اور حالات سے مایوس اور دل برداشتہ لوگوں کے لئے ناصحانہ انداز اپنایا۔علامہ اقبال نے ایک مصلح قوم کی طرح اپنے مخاطب کو غفلت اور مایوسی سے جگاتے ہوئے اسے تسخیر کائنات کے لیے تیار کیا۔علامہ نے قوم کی مایوسی دور کرنے' قوم میں ہمت پیدا کرنے کے لئے اپنی ایک نظم میں کہا:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

بہرحال علامہ اقبال کو قدرت نے وہ صلاحیت عطا کی تھی جس کے ذریعہ انہوں نے قوم میں بیداری' جدوجہد' خودی اور خوداعتمادی کے جذبات پیدا کئے۔پند ونصیحت بھی کی' برائیوں سے بچنے کا درس بھی دیا۔ضرورت اس بات کی ہے کہ علامہ کے کلام کو عمل کی نیت سے پڑھا جائے اور ان کے پیغام کو عام کیا جائے۔

ایس اے شکور

پروفیسر ایس اے شکور

ایڈیٹر

پروفیسر محمد علی اثر

مکان نمبر 20-4-226/9

چوک، حیدرآباد 500 002 (تلنگانہ)

اقبال اور حیدرآباد

اُردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ کا بسایا ہوا شہر حیدرآباد، ابتدا ہی سے علما، فضلا، شعرا اور اہلِ کمال کا قدر دان رہا ہے۔ سلاطینِ حیدرآباد، چاہے وہ قطب شاہی ہوں یا آصف جاہی، اُن کی دریا دِلی اور فیاضی کا شہرہ نہ صرف برِ عظیم ہند و پاک میں، بلکہ دیگر اقطاعِ عالم میں بھی پھیلا ہوا تھا۔ دبستانِ دہلی اور لکھنؤ کی تباہی کے بعد، حیدرآباد دکن ہی علوم و فنون کا گہوارہ بن گیا تھا، نیز حکومتِ حیدرآباد ہی ہندوستان کی سب سے بڑی اسلامی ریاست تھی۔ یہاں کے علم دوست اور رعایا پرور بادشاہوں، رئیسوں اور امیروں نے اربابِ کمال اور اہلِ قلم و اہلِ سخن کی دل کھول کر قدر افزائی اور سرپرستی کی۔ یہی سبب ہے کہ نہ صرف ہندستان، بلکہ دیگر ممالک کے شعرا اور ادبا، قدر دانی کی توقع میں حیدرآباد آتے رہے اور بعض ہمیشہ کے لیے یہیں بس گئے اور یہیں کی خاک کا پیوند بن گئے۔

جہاں تک اقبال شناسی کا تعلق ہے، حیدرآباد دکن کو اس سلسلے میں متعدد امتیازات حاصل ہیں۔ اوّل تو یہ کہ حیدرآباد میں اقبال کے حینِ حیات ہی، ۹/جنوری ۱۹۳۸ء کو ٹاؤن ہال (موجودہ قانون ساز اسمبلی) میں پہلا یوم اقبال منایا گیا، جس کے پہلے اجلاس کا افتتاح نظامِ دکن کے ولی عہد شہزادۂ برار نواب اعظم جاہ بہادُر نے کیا تھا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ:

اقبال نے اپنے فارسی اور اردو کلام سے موجودہ نسل کے ذہن کو متاثر کیا ہے۔ بجا طور پر وہ دُنیا کے ایک بہت بڑے مفکر اور مصنف ہیں۔ ان کی شاعری بنی نوع انسان کے لیے ایک پیغام کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی وہ خصوصیات ہیں، جن کا حیدرآباد اعتراف کر رہا ہے۔[1]

اس اجلاس میں سر اکبر حیدری نے بھی تقریر کی تھی اور پنڈت جواہر لعل نہرو، سروجنی نائیڈو، رابندر ناتھ ٹیگور، ہز ہائی نس سر آغا خان اور دوسرے اکابر اور مشاہیر کے پیغامات سنائے گئے۔

دوسرے اجلاس کی صدارت مہاراجا سر کشن پرشاد شاؔد نے کی۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ:

''اردو شاعری کے اس جنم بھوم میں آج کا دن حقیقت میں ایک یادگار دن ہے، کیوں کہ ہم اقبال جیسے مشہور و مقبول شاعر کی خصوصیات کی داد و تحسین کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ مجھے اس امر کی مسرت ہے کہ آپ نے اس جلسے کے دوسرے اجلاس کی صدارت کا اعزاز مجھے عطا

کیا۔ میرے اقبال سے ذاتی تعلقات بھی ہیں، یہی تعلقات مجھے اپنی کم نظری کے باوجود اس کا مستحق ٹھہراتے ہیں''۔۲؎

جشنِ اقبال کے ان اجلاسوں میں مہمانوں اور مندوبین کے علاوہ کثیر تعداد میں سامعین نے بھی شرکت کی تھی۔ ایک اندازے کے مطابق کم سے کم چھ ہزار سامعین نے ان اجلاسوں میں شرکت کی تھی۔ اس عظیم الشان جلسے کے صرف ۳/ماہ بعد اقبال نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

علامہ اقبال کی وفات کے بعد ان کے شایانِ شان پہلا اقبال نمبر شائع کرنے کا فخر بھی حیدرآباد کے رسالہ سب رس (جون ۱۹۳۸ء) کو حاصل ہے۔ اس خصوصی شمارے میں اقبال کے قریبی دوستوں کے مضامین و مقالات کے علاوہ نایاب تصاویر اور ان کی زندگی کے آخری زمانے کے حالات و واقعات بھی پیش کیے گئے ہیں، جو خاصے کی چیز ہیں۔

حیدرآباد کے میر حسن الدین (ڈاکٹر حسن الدین احمد نہیں) کو علامہ اقبال کے پہلے اردو مترجم کا اعزاز حاصل ہے، جنھوں نے اقبال کی زندگی ہی میں ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے *The Development of Metaphysics in Persia* کا اردو ترجمہ فلسفۂ عجم کے عنوان سے ۱۹۳۶ء میں شائع کیا۔ بانگ درا سائز کے ۱۷۷/صفحات پر محتوی اس کتاب کے ناشر کا نام انجمن اشاعتِ اُردو حیدرآباد ہے۔

مکاتیب اقبال کا پہلا مجموعہ بھی شاد اقبال کے عنوان سے حیدرآباد سے منظر عام پر آیا۔ اس کتاب کو ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اپنے عالمانہ مقدمے کے ساتھ مرتب کر کے سلسلہ مطبوعات ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد (شمار ۸۶) کے زیر اہتمام ۱۹۴۲ء میں شائع کیا تھا۔ شاد اقبال میں مہاراجا کشن پرشاد اور علامہ اقبال کے خطوط تاریخ وار مرتب کیے گئے ہیں۔ ۲۱۶/صفحات پر مشتمل اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ سرکشن پرشاد اور علامہ اقبال کی تصاویر اور ان کے خطوط کے عکس کے علاوہ، دونوں کے مراسم اور تعلقات کی رَوشنی میں، مرتب نے ایک پُر از معلومات اور سیر حاصل مقدمہ بھی لکھا ہے۔ مکاتیب شاد اقبال کا آغاز علامہ اقبال کے خط مؤرخہ یکم اکتوبر ۱۹۱۶ء سے ہوتا ہے، جس کا جواب مہاراجا نے ۱۰/اکتوبر کو دیا تھا۔ اسی طرح اس کتاب کا اختتام بھی ڈاکٹر اقبال کے خط مؤرخہ ۲۸/دسمبر ۱۹۲۶ء پر ہوتا ہے، جس کا جواب شاد نے ۴/جنوری ۱۹۲۷ء کو دیا۔ شاد اقبال کی اشاعت کے دو سال بعد سر محمد اقبال کے فکر و فلسفہ اور ان کے خیالات اور تصورات کو عوام و خاص تک پہنچانے کے لیے بزمِ اقبال حیدرآباد کے اربابِ مجاز نے پہلی تصویری نمائش ٹاؤن ہال (موجودہ: قانون ساز اسمبلی) حیدرآباد میں منعقد کی، جس کا افتتاح 'بلبل ہند' سروجنی نائیڈو نے کیا تھا۔ اس سلسلے میں بزمِ اقبال کے صدر امیر پائیگاہ نواب حسن یار جنگ نے حیدرآباد اور بیرونِ حیدرآباد کے مصوروں سے ذاتی طور پر اپیل کی تھی کہ وہ افکارِ اقبال کو اپنی حسن کاری کے ذریعے رنگ و روغن کی زبان میں پیش کریں، چناں چہ اس

سلسلے میں بھی حیدرآباد کے مدرسۂ فنونِ لطیفہ کے پرنسپل خان بہادُر سید احمد نے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں اور دیکھتے ہی دیکھتے بزمِ اقبال کے دفتر میں پینٹ کی ہوئی تصویروں کے انبار لگ گئے۔ ان تصاویر میں خاص کر معراج اقبال کی بنائی ہوئی پینٹنگ، جس میں 'پیرِ رومی اور مریدِ ہندی' میں بلا کا تاثر اُبھر آیا تھا۔

اقبال کے اردو کلام کی پہلی اشاعت کا افتخار بھی حیدرآباد کو ہی حاصل ہے۔ علامہ کے پہلے مجموعۂ کلام بانگ درا کی اشاعت سے پہلے اسی سال ۱۹۲۴ء میں مولوی عبدالرزاق راشد نے اقبال کے ایک زیادہ مکمل اردو کلام کو مختلف رسائل اور اخباروں سے یک جا کر کے کلیات اقبال کے نام سے چھاپا تھا۔ اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں علامہ اقبال سے اجازت لینے کے سلسلے میں مختلف محققین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

پروفیسر محی الدین قادری زور کی تحقیق کے مطابق، واقعہ یہ ہے کہ کلیاتِ اقبال کی اشاعت ہی نے لاہور والوں کو ترغیب دلائی کہ اقبال کا مجموعہ (کلام) وہاں سے بھی شائع ہونا چاہیے، چناں چہ انھوں نے بڑا ہنگامہ مچایا اور اقبال سے سر اکبر حیدری (صدر اعظم ریاست) کو لکھوایا کہ مرتب عبدالرزاق صاحب سے جواب طلب کریں۔ راشد صاحب نے سر اکبر کو وہ مراسلت دکھائی، جو اس سلسلے میں انھوں نے علامہ سے کی تھی۔ راشد صاحب نے ایک ہزار روپے حق تالیف (royality) دیا تھا، لیکن لاہور کے ناشرین کی خواہش پر علامہ اقبال نے حیدری صاحب کے ذریعے راشد صاحب کو پابند کر دیا کہ وہ کلیاتِ اقبال ریاست حیدرآباد کے باہر فروخت نہ کریں۔[۳] بعض اصحاب نے راشد صاحب کی مرتبہ کلیاتِ اقبال کی اشاعت کا سال ۱۹۲۳ء بتایا ہے، جو قطعی غلط ہے۔

اس کے برعکس خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں کہ حیدرآباد کے ایک صاحب نے رسالوں اور اخباروں سے ان (اقبال) کی تمام مطبوعہ نظمیں جمع کر کے ایک مجموعہ چھاپ کر بیچنا شروع کر دیا۔[۴] آخرالذکر بیان اس لیے قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کہ احباب کے متوجہ کرنے کے باوجود علامہ نے کبھی سنجیدگی سے اپنے کلام کی اشاعت کی طرف توجہ نہیں دی اور ہر بار وہ اپنے احباب کی خواہش کو ٹالتے رہے۔ اقبال اپنے کلام پر نظرِ ثانی کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جب اقبال کا متروک کلام کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال (مرتبہ: ڈاکٹر صابر کلوروی) منظر عام پر آیا تو اس کی ضخامت ۵۵۴ر صفحات تک پہنچ گئی۔

یہاں مولوی عبدالواحد معینی کے ایک مضمون 'کلیاتِ اقبال کی سرگذشت' (مشمولہ نقشِ اقبال) کا تذکرہ ضروری ہے۔ معینی صاحب کو کلیاتِ اقبال کے مرتب عبدالرزاق صاحب سے دیرینہ ہم نشینی کا شرف حاصل تھا۔ لاہور منتقل ہونے کے بعد انھوں نے کلیات کی اشاعت کے سلسلے میں راشد صاحب کو علامہ سے اجازت طلبی، حق تالیف اور چند دیگر امور سے واقفیت کے لیے چند سوالات پر مشتمل ایک تفصیلی خط لکھا تھا، جس کا جواب عبدالرزاق

راشد کے الفاظ میں درج کیا جاتا ہے: (مکتوب مؤرخہ ۲۲رجون۱۹۶۴ء)

آپ کے استفسارات کا فقرہ وار جواب یہ ہے:

۱) کلیاتِ اقبال مَیں نے علامہ اقبال کی تحریری اجازت کے بعد شائع کی تھی۔

۲) مَیں نے ایک ہزار روپے علامہ کو بطور رائلٹی دیے تھے۔

۳) مَیں نے پانچ سو جلدیں چھپوائی تھیں، مگر مالکِ مطبع نے بددیانتی سے ایک ہزار الگ طبع کر لی تھیں، جس کا مجھے بروقت علم نہ ہوسکا۔

۴) کوئی دوسو جلدیں مفت تقسیم کی گئیں، باقی تین سو پبلشر کو دے دی گئی تھیں، جو وہ فروخت کر رہا تھا۔

۵) علامہ کی خواہش کے احترام میں بیرونِ ریاست فروخت نہ کرنے پر رضامند ہوگیا تھا۔۵

کلیاتِ اقبال کی بیرونِ ریاست فروخت پر پابندی تھی، لیکن راشد صاحب نے اس کے متعدد نسخے تحفتہً اندرون اور بیرونِ ملک کے احباب اور باذوق حضرات کو بھیجے تھے۔ ان میں سے اکثر اربابِ ذوق نے مرتب کو اپنے تاثرات سے آگاہ کیا تھا۔ علامہ اقبال کے استاد اور اسرارِ خودی کے مترجم پروفیسر نکلسن نے تحریر کیا ہے کہ آپ کے اِنتخابات، اقبال کی ہمہ گیر تنقید، زندگی کی ایک عمدہ تصویر پیش کرتے ہیں اور ان کی ترتیب میں آپ کے ذوقِ سلیم کا پتہ چلتا ہے۔

اس کے علاوہ نواب عمادالملک بہادر، نواب سرامین جنگ، مولوی عبدالحق، مولانا سلیمان ندوی اور دیگر علما و فضلا نے بھی اپنے مکاتیب میں کلیاتِ اقبال اور خصوصاً راشد صاحب کے دیباچے کی بے حد ستائش کی۔

۱۹۲۹ء میں جب اقبال نے حیدرآباد کا دوسری بار سفر کیا تھا تو علامہ اقبال راشد صاحب سے ملاقات کے لیے ان کے گھر گئے اور فرمایا:

آپ نے جو میری نظموں کا دیباچہ لکھا ہے، وہ آپ کے کلچر اور نصب العین کا پتا دیتا ہے۔ مَیں اس کے لیے کماحقہٗ آپ کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہوں۔

عبدالرزاق راشد نے جواباً علامہ سے کہا کہ آپ (اقبال) نے جو کلیاتِ اقبال کی اشاعت کی اجازت دی، مَیں اس کے لیے سراپا سپاس ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ کلیات، شعرائے دکن کے حق میں اکسیر ثابت ہوئی ہے اور انھوں نے اس سے کماحقہٗ استفادہ کیا ہے۔ اس کے مطالعے سے شعرائے دکن کی کایا پلٹ ہوگئی ہے اور شاعری کی پگڈنڈی ہی بدل گئی ہے۔۶

علامہ اقبال نے عطیہ فیضی کے سفارشی خط کے ساتھ ۱۹۱۰ء میں جب حیدرآباد کا پہلا سفر کیا تھا اور وہ سر اکبر حیدری کے یہاں مہمان رہے، اسی زمانے میں انہوں نے نظم طباطبائی سے ملاقات کی اور ان سے کلام سنانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اس محفل میں عبدالرزاق صاحب بھی موجود تھے۔ نظم نے جو نظم سنائی، اس کا ایک شعر یہ ہے:

ہے شفق یا وادیِ فیروزہ گوں میں لالہ زار
ہے سحر یا سبزہ زارِ آسماں میں آبشار

راشد صاحب کے بقول، نظم کی سماعت کے دَوران علامہ عش عش کررہے تھے۔ اس نظم سے اقبال اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کی طبیعت میں ہیجان پیدا ہوا اور انھوں نے اسی زمین میں 'طلوعِ سحر' کے موضوع پر ہی ۳۸/اشعار پر مشتمل نظم 'نمودِ سحر'، جس کا نام بعد میں 'نمودِ صبح' کردیا گیا، تخلیق کی۔ یہی نظم جب بانگِ درا میں شامل ہوئی تو اس کے ۲۹/اشعار حذف کردیے گئے۔ علامہ کی مشہور نظم 'گورستانِ شاہی' بھی ان کے پہلے سفر حیدرآباد کی یادگار ہے۔ 'گورستانِ شاہی' کے ۱۹/اشعار رسالہ مخزن میں اقبال کے درج ذیل نوٹ کے ساتھ جون ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئے:

''حیدرآباد دکن کے مختصر قیام کے دَوران میرے عنایت فرما جناب مسٹر نذر علی صاحب بی اے معتمد محکمہ فنانس۔ مجھے ایک شب ان شاندار، مگر حسرت ناک گنبدوں کی زیارت کے لیے لے گئے، جن میں سلاطینِ قطب شاہیہ سو رہے ہیں۔ رات کی خاموشی، ابر آلود آسمان اور بادلوں میں سے چھن کے آتی ہوئی چاندنی نے اس پُرحسرت منظر کے ساتھ مل کر میرے دل پر ایسا اثر کیا، جو کبھی فراموش نہ ہوگا۔ ذیل کی نظم ان ہی بے شمار تاثرات کا ایک اظہار ہے۔ اس کو مَیں اپنے سفر حیدرآباد کی یادگار میں مسٹر حیدری اور ان کی لَیِق بیگم صاحبہ مسز حیدری کے نامِ نامی سے منسوب کرتا ہوں، جنھوں نے میری مہمان نوازی اور میرے قیامِ حیدرآباد کو دل چسپ ترین بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا''۔

اسی سفر کے دَوران علامہ اقبال کو اَورنگ آباد دکن میں چند یوم قیام کرنے اور اَورنگ زیب عالم گیر کے مزار پر ۱۸/مارچ ۱۹۱۰ء کو حاضری دینے کا موقع ملا۔ جب علامہ نے شہنشاہ اَورنگ زیب کے مزار کو دیکھا اور وہاں کچھ دیر وہ اپنے احباب کو روانہ کرکے تنہا بیٹھے رہے تو ان کے ذہن میں ہندستان کے اس ولی صفت بادشاہ کے واقعاتِ حیات اُبھر آئے۔ وہ اپنے جذبات پر قابو نہ پاسکے اور زار و قطار روتے ہوئے وہیں پر انھوں نے چند اشعار موزوں کیے، چناں چہ مس عطیہ فیضی کے نام لاہور سے ایک خط مؤرخہ ۳۰/مارچ ۱۹۱۰ء تحریر کرتے ہوئے لکھا ہے:

میری اتفاقی چھٹی فقط دس دن کی تھی اور وہ ۲۸/تاریخ (مارچ ۱۹۱۰ء) کو ختم ہوگئی۔ مَیں حیدرآباد سے ۲۳ کو روانہ ہوا اور حیدرآباد سے لاہور تک جانے میں تقریباً چار دن لگے ہیں۔ اس کے علاوہ مجھے واپسی پر اَورنگ زیب کے مقبرے کی زیارت بھی کرنی تھی، جس پر مَیں ایک نہایت ولولہ انگیز نظم لکھنے والا ہوں، جو اردو پڑھنے والوں کے لیے نہایت درجہ رُوح پرور ہوگی۔ ے

علامہ اقبال کی اہلِ حیدرآباد سے نصف ملاقات کا سلسلہ داغ کی وفات (۱۴/فروری ۱۹۰۵ء) سے پہلے شروع ہوچکا تھا۔ مولوی عبدالرؤف عروج نے 'حیدرآباد اقبال سے پہلا تعلق' کے عنوان سے ان کے ایک خط مؤرخہ ۲۸/فروری ۱۸۹۹ء کا حوالہ دیا ہے، جس کے مکتوب الیہ مولانا احسن مارہروی تھے۔ اقبال نے ان سے اپنے استاد

داغ دہلوی کی تصویر ارسال کرنے کی خواہش کی تھی۔ ۸؎

اہلِ نظر جانتے ہیں کہ داغ، علامہ کے استادِ سخن تھے۔ مذکورہ خط اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور سے لکھا تھا۔ اقبال کو داغ کی شاگردی پر ناز تھا، چناں چہ جب داغ کا انتقال ہوا تو انھوں نے اس سانحے پر ایک درد ناک نظم لکھی تھی، جس کا ایک مصرع ہے: ......آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے۔

حیدرآباد کے اسی سفر کے دَوران علامہ، فصاحت جنگ جلیل کے ہاں بھی مدعو تھے، جہاں ظہیر دہلوی اپنی ضعیفی اور کمزوری کے باوجود تشریف لائے تھے۔ حضرت جلیل، داغ کے بعد نظامِ دکن کے استادِ سخن مقرر ہوئے تھے۔ پہلے سفر کے دَوران سر اکبر حیدری نے جن ادبا اور شعرا سے اقبال کی ملاقات کروائی، ان میں مہاراجا کشن پرشاد بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ مہاراجا نے علامہ کی مہمان نوازی کچھ اس انداز سے کی کہ اقبال کے دل پر مہاراجا کے نقوش بہت گہرے ثبت ہوگئے، چناں چہ علامہ نے ایک خط میں لکھا ہے:

''ہز ایکسی لینسی (مہاراجا شاد) کی نوازشِ کریمانہ اور وسعتِ اَخلاق نے جو نقش میرے دل پر چھوڑا، وہ میرے لوحِ دل سے کبھی نہ مٹے گا''۔ ۹؎

حیدرآباد دکن اور اقبالیات کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد میں شائع ہونے والی مطبوعات کی ایک فہرست بھی پیش کردی جائے۔ اس طرح کی کئی اَور بھی فہرستیں مختلف کتابوں اور رسالوں میں شائع ہوئی ہیں، جن سے استفادہ کرتے ہوئے راقم نے اس فہرستِ کتبِ اقبالیات میں قارئین کو زیادہ سے زیادہ معلومات پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ اس فہرست میں کچھ نام شامل ہونے سے رہ گئے ہوں۔ (اس طرح کی کسی بھی فہرست کو قطعی نہیں کہا جا سکتا)

حیدرآباد کے عبدالرزاق راشد کی مرتبہ کلیاتِ اقبال کو اقبالیات کے موضوع پر حیدرآباد سے شائع ہونے والی پہلی کتاب کا امتیاز حاصل ہے۔ ۳۹۶/صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۱۹۲۴ء میں منظرِ عام پر آئی۔ نظر حیدرآبادی اور بعض دیگر مصنفین نے اس کتاب کی تاریخ اشاعت ۱۹۲۳ء بتائی ہے، جو قطعی غلط ہے۔ یہ ضرور ہے کہ عبدالرزاق راشد نے کلیاتِ اقبال کا دیباچہ [۳۱/دسمبر] ۱۹۲۳ء میں لکھا تھا، لیکن اس کی تاریخ طبع ۱۹۲۴ء ہی ہے۔ اس کتاب کا نیا عکسی اڈیشن ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے تعارُف و تقدیم کے ساتھ ۲۰۰۷ء میں بیکن بکس لاہور سے شائع ہوا۔ کلیاتِ اقبال کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ راشد صاحب نے اس پر ۱۳۶/صفحات کا ایک سیر حاصل مقدمہ لکھا، جسے کلامِ اقبال کی پہلی تنقید اور اس کے مؤلف کو علامہ اقبال کا پہلا نقاد کہا جا سکتا ہے۔

۱۹۳۶ء میں حیدرآباد کے میر حسن الدین نے فلسفۂ عجم کے نام سے اقبال کے پی ایچ ڈی کے مقالے The Development of Metaphysics in Persia

کا ترجمہ شائع کیا۔ ۱۷۷ صفحات اور بانگِ درا سائز کی اس کتاب کے ناشر انجمن اشاعت اردو حیدرآباد کے معتمد تصدق حسین تاج ہیں۔ دیباچے میں مترجم نے اطلاع دی ہے کہ انہوں نے ۱۹۲۷ء میں اقبال سے اس کتاب کا ترجمہ کرنے کی اجازت طلب کی تھی اور اس کے ایک سال بعد اس کام کو مکمل کر لیا تھا۔

میر حسن الدین نے ۱۹۳۶ء میں 'خطبات اقبال' کا ترجمہ بھی ترجمۂ خطبات کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس کتاب کے ناشر کا نام انجمن اشاعت اردو حیدرآباد ہے۔

۱۹۳۷ء میں انجمن اشاعتِ اردو کے معتمد تصدق حسین تاج نے نظم اقبال، سفر نامہ حیدرآباد دکن اور تاثرات کے عنوان سے ایک کتابچہ شائع کیا تھا، جو اقبال کی دو منظومات 'شکریہ' اور 'گورستانِ شاہی' اور سرعبدالقادر اور علامہ اقبال کی تمہیدوں پر مشتمل ہے۔

مئی ۱۹۳۸ء میں سب رس حیدرآباد دکن کا اقبال نمبر، مرتبہ حمید الدین شاہد اور صاحبزادہ میکش، ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد کی جانب سے اور اکتوبر ۱۹۳۸ء ہی میں رسالہ اردو کا اقبال نمبر، مرتبہ مولوی، عبدالحق اورنگ آباد دکن سے منظر عام پر آیا۔

۱۹۳۹ء میں اقبال کے مضامین پر مشتمل تصدق حسین تاج کی کتاب تبرکاتِ اقبال [مضامینِ اقبال] کے علاوہ، ابو ظفر عبدالواحد کی کتاب متاعِ اقبال شائع ہوئی۔ اس کتاب کو ادبی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اب یہ بالکل نایاب ہے، اس لیے اس پر تبصرے سے ہم قاصر ہیں۔

اقبال کی وفات کے چار سال بعد ۱۹۴۲ء میں ڈاکٹر زور نے مکاتیب اقبال کا پہلا مجموعہ شاد اقبال کے نام سے تاریخ وار مرتب کر کے ادارۂ ادبیاتِ اردو کی جانب سے شائع کیا۔ ۱۹۴۲ء ہی میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی معرکتہ الارا کتاب رُوحِ اقبال منظر عام پر آئی۔ ۱۹۴۳ء میں مشتاق احمد چشتی نے اقبال کے خطوط جناح کے نام مرتب کر کے حیدرآباد سے شائع کی۔

۱۹۴۴ء میں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے ۴۸ صفحات پر محیط ایک کتابچہ اقبال کا تصورِ زماں و مکاں مرتب کر کے ادارۂ اشاعتِ اردو حیدرآباد کی جانب سے شائع کیا تھا۔ اسی سال دو اَور کتابیں آثارِ اقبال اور Iqbal: Art and Thought بھی شائع ہوئیں۔ اوّل الذکر کتاب کے مرتب ڈاکٹر غلام دستگیر رشید ہیں۔ ۱۹ مضامین اور ۳۰۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب کے ناشر کا نام ادارۂ اشاعتِ اردو حیدرآباد ہے۔ آخر الذکر کتاب کے مصنف ایس اے واحد ہیں اور یہ کتاب گورنمنٹ پریس حیدرآباد سے چھپی ہے۔

۱۹۴۵ء میں اقبالیات کے موضوع پر دو کتابیں شائع ہوئیں۔ پہلی، پروفیسر غلام دستگیر رشید کی حکمتِ اقبال، جو نفیس اکیڈمی حیدرآباد کی جانب سے چھپی ہے اور دوسری، اشفاق حسین کی مقامِ اقبال ہے۔ یہ کتاب ادارہ اشاعتِ اردو حیدرآباد کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی ہے۔

حسن الاعظمی کی کتاب الحیاۃ والموت فی فلسفۃ الاقبال ۱۹۴۶ء میں بزمِ اقبال حیدرآباد کی جانب سے

شائع ہوئی۔ بانگ درا سائز کی یہ کتاب ۲۲۴ رصفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

یہاں شاغل فخری کی کتاب تصوراتِ اقبال اور عزیز احمد کی کتاب اقبال نئی تشکیل کا تذکرہ بھی ضروری ہے، جو بالترتیب ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۸ء میں شائع ہوئیں۔

عبدالرحمٰن چغتائی کی مرقعِ اقبال ۱۹۴۸ء میں بزمِ اقبال کمیٹی حیدرآباد کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی۔ ۳۰ رصفحات پر مشتمل اس کتابچے کی شانِ نزول یہ ہے کہ ۱۶ تا ۲۱ راپریل ۱۹۴۸ء میں 'ہفتہ اقبال' منایا گیا تھا۔ اس سلسلے میں ایک نمائش 'حسن کاریِ چغتائی خاں بہادر عبدالرحمٰن' (لاہور) راجا پرتاب گیرجی کی کوٹھی پان منڈی حیدرآباد میں ترتیب دی گئی تھی۔ اس نمائش کا افتتاح راجا بہادر پی وینکٹ ریڈی، نائب صدرِ اعظم دولتِ آصفیہ نے کیا تھا۔ اس کتاب کا پیش لفظ نواب صدر یار جنگ بہادر اور تعارف خواجہ محمد احمد ناظم سررشتۂ آثارِ قدیمہ سرکارِ عالی نے تحریر کیا ہے۔ آخر الذکر صدر 'مجلس نمائش اقبال' بھی تھے۔

مرقعِ اقبال کے ابتدائی صفحات میں آصف سابع نواب میر عثمان علی خاں کی تصویر مع علامہ اقبال کی نظم (اے مقامت برتر از چراخ بریں + از تو باقی سطوتِ دینِ مبیں) شامل ہے۔ اس کے بعد معین الدین کولاس (معتمد بزمِ اقبال) کا مضمون 'شاعر مشرق اور بہزاد مشرق' ہے اور آخر میں نمائش میں پیش کیے ہوئے چھہتر (۷۶) مرقعوں کی فہرست عناوین اور اشعار کے ساتھ شامل کتاب ہے۔

فرزندانِ جامعہ عثمانیہ میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی کتاب فکرِ اقبال اقبالیات کے مطالعے میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔

ڈاکٹر ظہیرالدین احمد الجامعی کی کتاب اقبال کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی پہلی بار حیدرآباد سے ۱۹۵۱ء میں اور دوسری بار ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی۔ ۱۳۲ رصفحات پر مشتمل اس کتاب کے ناشر خود مصنف تھے۔ اب تیسری بار اقبال اکیڈیمی حیدرآباد دکن نے چھاپی ہے۔

۱۹۴۰ء میں مولانا ابومحمد مصلح کی کتاب قرآن اور اقبال شائع ہوئی۔ ۱۹۱ رصفحات پر مشتمل اس دیدہ زیب کتاب کے ناشر کا نام ادارہ عالمگیر تحریک قرآن مجید، حیدرآباد دکن ہے۔

بچوں کے ادب سے متعلق ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی کتاب اقبال سخن نیشنل فائن پرنٹنگ پریس حیدرآباد کے زیرِ اہتمام ۱۹۵۳ء میں منظر عام پر آئی۔ ۸۸ رصفحات پر محیط اس کتاب کا پہلا اڈیشن ۱۹۵۳ء میں اور دوسرا ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔

۱۹۵۴ء میں سید رشید الحسن کی کتاب انتخابِ اقبال کے عنوان سے الھدیٰ بک ایجنسی حیدرآباد سے شائع ہوئی، جو ۸۲ رصفحات پر مشتمل ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے ماہر اقبالیات و دکنیات ڈاکٹر غلام عمر خاں کی اقبال سے متعلق پہلی کتاب ''رُوحِ اسلام اقبال کی نظر میں'' کے نام سے ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی۔

۱۱۶/صفحات پر مشتمل اس کتاب کے ناشر کا نام انسٹی ٹیوٹ آف انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز حیدرآباد دکن ہے۔

۱۹۶۴ء میں ڈاکٹر بی گوپال ریڈی کی کتاب اقبال کو یتلو کے نام سے تلگو زبان میں حیدرآباد سے شائع ہوئی۔ ڈاکٹر غلام عمر خاں کی اقبالیات سے متعلق دوسری کتاب اقبال کا تصورِ عشق نیشنل بک ڈپو حیدرآباد سے ۱۹۶۴ء ہی میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کا دوسرا اڈیشن ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔

۱۹۶۵ء میں ابو عبداللہ محمد کی ۹۶/صفحات پر مشتمل کتاب اقبال اسلامی پس منظر میں کے نام سے اشاعت پذیر ہوئی۔ پیش لفظ ڈاکٹر عبداللطیف نے لکھا ہے اور اس کتاب کے ناشر دائرہ الکٹرک پریس چھتہ بازار حیدرآباد ہیں۔

ڈاکٹر غلام عمر خاں صاحب کی اقبالیات سے متعلق تیسری کتاب اقبال کا تصورِ خودی ادارہ ادبیاتِ اردو حیدرآباد کے زیرِ اہتمام ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی۔ ۱۶۰/صفحات پر محیط اس کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے لکھا ہے۔ ڈاکٹر صلاح الدین احمد کی کتاب تصوراتِ اقبال کا پہلا اڈیشن ۱۹۶۶ء میں حیدرآباد سے چھپا تھا۔ اس کتاب کا دوسرا اڈیشن معز الدین احمد کی ترتیب کے ساتھ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ ۴۰۰/صفحات پر مشتمل اس کتاب کا مقدمہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے۔

۱۹۶۸ء میں قرآن و سیرت سوسائٹی حیدرآباد کی جانب سے حضرتِ اقبال کا نعتیہ کلام کے عنوان سے سید محمد ابراہیم نہری کی ۲۴/صفحات پر محتوی کتاب شائع کی۔ اقبال کے اردو شعری مجموعوں بانگِ درا، ضربِ کلیم اور بالِ جبریل کے منتخب نعتیہ کلام پر مشتمل اس کتاب کا دیباچہ سید مظہر الحق قادری نے لکھا ہے۔

اقبال کے پہلے شعری مجموعے بانگِ درا (حصہ اول) کا پہلا حیدرآبادی اڈیشن مع تشریح اشعار ۱۹۷۳ء میں حیدرآباد سے چھپا۔ ۱۶۰/صفحات کی اس کتاب کے مرتب اور ناشر تنویر پبلی کیشنز حیدرآباد تھے۔

۱۹۷۴ء میں اشفاق حسین کی کتاب اقبال اور انسان آندھرا پردیش ساہتیہ اکادمی حیدرآباد سے شائع ہوئی۔ ۲۰۸/صفحات پر مشتمل اس کتاب کا تعارُف ڈاکٹر بی گوپال ریڈی نے لکھا ہے۔ ۱۴/دسمبر ۱۹۷۴ء میں کُل ہند اقبال صدی تقاریب کمیٹی حیدرآباد کے زیرِ اہتمام، حیدرآباد میں ایک سیمینار منعقد ہوا تھا، جس میں ملک کے ممتاز ماہرین اقبالیات نے مقالات پڑھے تھے۔ اس سیمینار میں پیش کیے جانے والے منتخب مقالات کو مذکورہ کمیٹی نے یک جا کر کے فکرِ اقبال کے نام سے کتابی صورت میں منظر عام پر لایا۔ اس کتاب کے مرتبین ڈاکٹر عالم خوندمیری اور ڈاکٹر مغنی تبسم ہیں۔ ڈاکٹر بجواڑہ گوپال ریڈی نے اقبال کے سو شعر کے عنوان سے ۱۴۲/صفحات پر مشتمل ایک کتاب شائع کی، جو دراصل اقبال کے سو اشعار کا تلگو زبان میں منظوم ترجمہ ہے۔ اس کتاب کا تعارُف عابد علی خاں اڈیٹر سیاست حیدرآباد نے تحریر کیا ہے۔ اسی سال مضطر مجاز کی ایک کتاب طلوعِ مشرق شائع ہوئی، جو

اقبال کی مثنوی پس چہ باید کرد اور مناجاتِ جاوید نامہ کے منظوم اردو ترجمے پر مبنی ہے۔ ۹۲ر صفحات پر مشتمل اس کتاب کا مقدمہ ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب نے لکھا ہے۔ اس کتاب کے پبلشر کا نام انجمن نمودِ ادب حیدر آباد ہے۔

۱۹۷۶ء میں اقبال اور عظمتِ آدم کے نام سے قدیر امتیاز کی ایک کتاب شالیمار پبلی کیشنز حیدرآباد کے زیرِ اہتمام منظر عام پر آئی۔ ۱۱۲ر صفحات پر محیط اس کتاب کا حرفِ آغاز محمود خاور نے اور پیش لفظ خود مصنف نے لکھا ہے۔ اقبال اکیڈمی حیدرآباد کے ششماہی ترجمان اقبال ریویو نومبر ۲۰۱۰ء کے مطابق ۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر غلام عمر خاں کی کتاب ''عورت اقبال کی نظر میں'' شائع ہوئی۔ (ص ۶۳)

۱۹۷۷ء میں عقیل الرحمٰن عقیل نے ''نذرِ اقبال'' کے عنوان سے ۷۶ صفحات پر مشتمل ایک کتاب نیشنل پوئٹری فورم حیدرآباد کی جانب سے شائع کی، جو مختلف حیدرآبادی شعرا کے کلام پر مشتمل ہے۔ اسی سال مضطر مجاز نے علامہ اقبال کے فارسی مجموعہ کلام ''ارمغانِ حجاز'' کا اردو منظوم ترجمہ اسی نام سے شائع کیا۔ اس کے ناشر بھی خود مترجم ہی ہیں۔ ۲۱۲ر صفحات پر مشتمل اس کتاب کا پیش لفظ پروفیسر سید عالم خوندمیری نے لکھا ہے۔

۱۹۷۹ء میں اقبال اکیڈمی حیدرآباد کی جانب سے ''اقبالیاتِ ماجد'' کے عنوان سے ۷۰ر صفحات پر محیط ایک کتاب شائع ہوئی، جس کے مرتبین مصلح الدین سعدی اور محمد ظہیر الدین ہیں۔ اسی برس ''تبویبِ کلام اقبال'' (حصہ اوّل) نامی ایک کتاب میر ولایت علی نے تالیف کی۔ ۱۵۲ر صفحات پر مشتمل اس کتاب کے کا نام ناشر ادارۂ علمیہ حیدرآباد ہے۔ ۱۹۷۹ء ہی میں ڈاکٹر نوری کی ایک کتاب ڈاکٹر اقبال سے ادب کے ساتھ شائع ہوئی۔ ۸۰ر صفحات پر مشتمل اس کتاب کے پبلشر کا نام سرکوتھراپی سنٹر حیدرآباد ہے۔ اسی سال اقبال اکیڈمی حیدرآباد کی جانب سے اقبال کا ذہنی سفر کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی۔ ۴۸ر صفحات پر مشتمل اس کتابچے کو کریم رضا اور مظہر لطیفی نے مرتب کیا ہے۔

۱۹۸۰ء میں مصلح الدین سعدی کی مرتبہ کتاب اقبالیاتِ باقی اقبال اکیڈمی حیدرآباد کے زیرِ اہتمام منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب ۹۶ر صفحات کا احاطہ کرتی ہے۔ اسی برس مضطر مجاز کی جاوید نامہ کے منظوم اردو ترجمے پر مبنی کتاب اسی نام سے اقبال اکیڈمی حیدرآباد کے زیرِ اہتمام منظر عام پر آئی۔ ۱۷۲ر صفحات پر محتوی اس کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر انا میری شمل نے تحریر کیا ہے اور انگریزی سے ترجمہ ڈاکٹر یوسف کمال نے کیا ہے۔

۱۹۸۲ء میں اقبال کے فکر و فن پر دس مضامین کا مجموعہ چشمۂ آفتاب کے نام سے مصلح الدین سعدی نے مرتب کر کے اقبال اکیڈمی حیدرآباد سے شائع کیا۔ ۸۴ر صفحات پر مشتمل اس کتاب میں گیان چند جین، سید سراج الدین، مغنی تبسم، سلیمان اطہر جاوید، یوسف سرمست، عبدالحق، عبدالقوی دسنوی، عالم خوندمیری اور نعیم الدین کے مضامین شامل ہیں۔

۱۹۸۳ء میں امتہ الکریم کی ایک کتاب ''اقبال کی

قومی شاعری'' کے عنوان سے اشاعت پذیر ہوئی۔ ۹۴ رصفحات پر مشتمل اس کتاب کا 'حرفِ آغاز' ڈاکٹر مغنی تبسم نے تحریر کیا ہے، پیش لفظ ڈاکٹر یوسف سرمست نے لکھا ہے اور 'تعارف' ڈاکٹر محمد علی اثر نے قلم بند کیا ہے۔

۱۹۸۵ء میں حسامی بک ڈپو حیدرآباد کی جانب سے تصدق حسین تاج کی کتاب مضامین اقبال کا ۲۸۲ رصفحات پر محیط تیسرا اڈیشن (مع اضافہ مضامین و سوانح حیات) شائع ہوا۔ اس کتاب کا پہلا اڈیشن ۱۹۴۴ء میں اور دوسرا اڈیشن ۱۹۶۸ء میں حیدرآباد ہی سے چھپا تھا۔ ۱۹۸۵ ہی میں پروفیسر عالم خوندمیری کی کتاب اقبال کشش و گریز کے عنوان سے اقبال اکیڈمی حیدرآباد کے زیرِ اہتمام منصۂ شہود پر آئی۔ اقبال پر عالم خوندمیری کے مضامین پر مشتمل اس کتاب کو محمد ظہیرالدین احمد نے مرتب کیا ہے اور مقدمہ سید خلیل اللہ حسینی نے لکھا ہے۔ اسی سال اقبال اکیڈمی حیدرآباد کی جانب سے سید شکیل احمد کی کتاب اقبال نئی تحقیق شائع ہوئی۔ ۷۰ رصفحات پر محیط اس کتاب میں آندھرا پردیش آرکائیوز کی امثلہ پر مبنی علامہ اقبال کے حالات، غیر مطبوعہ خطوط کے ذریعے، ان کی حیات اور فکر و فن کے بعض نئے گوشے سامنے آتے ہیں۔

سید شکیل احمد کی ایک اَور کتاب اقبال اور حیدرآباد ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی۔ ۸۷ رصفحات پر محتوی اس کتاب کو الکتاب پبلشرز حیدرآباد نے شائع کیا ہے۔ اسی برس الکتاب پبلشرز حیدرآباد نے ابو محمد مصلح الدین کی کتاب قرآن اور اقبال کا دوسرا اڈیشن شائع کیا۔ ۱۹۲ رصفحات پر مشتمل اس کتاب کا پہلا اڈیشن ۱۹۴۰ء میں چھپا تھا۔

۱۹۸۷ء میں محمد جمیل الدین صدیقی نے ''مسلمانوں کے زوال کے اسباب: اقبال کی نظر میں'' (حصہ اوّل) رحمٰن پبلشرز حیدرآباد کی جانب سے شائع کی۔ اس کتاب کا حجم ۳۴ رصفحات ہے۔ اسی مصنف کی دو اَور کتابیں ''مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں مسئلۂ تقدیر اقبال کی نظر میں اور ''مسلمانوں کے عہدِ زوال میں عورت کا رول اور اقبال'' ۱۹۸۷ء ہی میں شائع ہوئیں۔ اوّل الذکر کتاب کی ضخامت ۳۴ رصفحات اور آخر الذکر کی ۲۷ رصفحات ہے۔

مذکورہ بالا پبلشر نے ۱۹۸۸ء میں محمد جمیل الدین صدیقی کی مزید کتابیں شائع کی ہیں۔

۱۔ علامہ اقبال کے نظریات۔ ۴۸ رصفحات
۲۔ فلسفۂ زندگی اور موت اور اقبال۔ ۴۸ رصفحات
۳۔ فلسفۂ جہاد فی سبیل اللہ اور علامہ اقبال۔ ۴۶ رصفحات
۴۔ فلسفۂ شہادت امام حسین عالی مقام اور اقبال۔ ۴۶ رصفحات
۵۔ اقبال کے نظریات (۲)۔ ۸۴ رصفحات
۶۔ فلسفہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ اور علامہ اقبال۔ ۴۶ رصفحات

۱۹۸۸ء ہی میں اردو ریسرچ سنٹر حیدرآباد نے ڈاکٹر گیان چند کی کتاب ابتدائی کلام اقبال شائع کی۔ یہ کتاب ۱۴+۴۵۹ رصفحات پر مشتمل ہے۔ اسی سال سید غلام محمد کیفی شاہ نظامی حیدرآبادی نے ۱۹۲ رصفحات پر محتوی ایک کتاب کلامِ اقبال کی رُوحانی و انقلابی عظمت کے نام سے مرتب

کر کے شائع کی۔

۱۹۹۲ء میں شاہ محی الدین کی کتاب شاعرِ مشرق علامہ اقبال شائع ہوئی۔

۱۹۹۶ء میں مضطر مجاز کی کتاب پیامِ مشرق (ترجمہ) چھپی۔

۱۹۹۷ء میں سید یعقوب شمیم کی کتاب ''اقبال اور تحریکِ آزادیِ ہند'' شائع ہوئی۔

۲۰۰۱ء میں الطاف سلطانہ کی کتاب '' آؤ اقبال سے ملیں'' منظرعام پر آئی۔

۲۰۰۲ء میں عبدالرحمٰن ظفر کی کتاب ''اقبال کا سائنسی منہاجِ فکر'' چھپی۔

۲۰۰۳ء میں انیس الدین کی کتاب ''قرآن اور ماحولیات'' شائع ہوئی۔

۲۰۰۵ء میں ڈاکٹر یوسف اعظمی کی کتاب ''اقبال اور جہانِ نو'' اشاعت پذیر ہوئی۔

۲۰۰۷ء میں پروفیسر سید سراج الدین کی کتاب ''جاوید نامہ'' منظرعام پر آئی۔

۲۰۰۸ء میں عزیز احمد کی کتاب ''اقبال نئی تشکیل'' شائع ہوئی۔

۲۰۱۰ء میں ڈاکٹر غلام دستگیر کی کتاب ''اقبال کی نعتیہ شاعری'' شائع ہوئی۔

۲۰۱۲ء میں محمد ظہیر الدین کی کتاب ''اقبال کے ساتھ چند قدم'' اقبال اکیڈمی حیدرآباد دکن نے شائع کی۔ کتاب ۱۳۲ر صفحات پر مشتمل ہے۔

۲۰۱۲ء پروفیسر غلام عمر خاں نے اقبالیات سے متعلق اپنی تمام کتابوں کو یکجا کر کے ''ذکر اقبال'' کے نام سے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب طباعت کے آخری مراحل میں ہے۔

درج ذیل کتابوں پر سنہ تصنیف کا اندراج نہیں ہوا۔

علامہ اقبال کی داستانِ دکن میر محمود حسین۔ ارد و اکیڈمی حیدرآباد۔

کلیاتِ اقبال۔ کمرشل بک ڈپو حیدرآباد۔

حیدرآباد دکن سے درج ذیل انگریزی کتابیں بھی شائع ہوئیں۔

The Mosque of Corova: A translation into English verse of Iqbal's poem 'Masjid-e-Qurtaba', Translated by M.A. Haleem. Iqbal Academy, Hyderabad-1973

Three Articels of Iqbal by Md. Zaheer Ahmed. Iqbal Academy, Hyderabad-1979

Shikwa Aur Jawab-e-Shikwa: English translation by S. Mehmood Ali Khan, Tyro. Iqbal Academy, Hyderabad-1973

Iqbal as Philosopher by Dr. Sajida Adeeb. Abul Kalam Azad Research Insititute, Hyderabad-1982

Iqbal East & West by Iqbal Academy,

Hyderabad-1994

Understanding Iqbal by Prof. S.Sirajuddin 2007

Iqbal ek Mard-e-Aafaqui by Raj Mohan Gandhi 2009

❁

حوالے اور حواشی:

۱) عبدالرؤف عروج: اقبال اور بزم اقبال (حیدر آباد دکن)، ص۴۴

۲) ایضاً، ص۴۵

۳) مضامین ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور جلد۲، مرتبہ رفیع الدین قادری، ص۴۱۲

۴) بحوالہ اقبال ریویو حیدر آباد دکن، جنوری ۱۹۶۶ء، ص۱۳۲

۵) سید عبدالواحد معینی: نقش اقبال، ص۶۸

۶) ایضاً، ص۸۳

۷) عطیہ فیضی: اقبال۔ مترجم ضیاء الدین احمد برنی، ص۴۹-۵۰

۸) اقبال اور بزم اقبال حیدر آباد، ص۱۷

۹) ایضاً، ص۲۸

کتابیات:

❁ عبدالرؤف عروج: اقبال اور بزمِ اقبال (حیدر آباد دکن)۔ کراچی: دارالادب، ۱۹۷۸ء

❁ عبدالواحد معینی، سید: نقشِ اقبال۔ لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۶۹ء

❁ عطیہ فیضی: اقبال مترجمہ ضیاء الدین احمد برنی۔ کراچی: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۵۶ء

❁ محمد اقبال، علامہ: *The Development of Metaphysics in Persia*۔ لندن: لوزاک، ۱۹۰۸ء

❁ محمد اقبال، علامہ: کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال مرتبہ ڈاکٹر صابر کلوروی۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۴ء

❁ محمد اقبال، علامہ: فلسفۂ عجم مترجمہ میر حسن الدین۔ حیدر آباد دکن: حافظ اکیڈیمی، ۱۹۳۶ء

❁ محمد اقبال، علامہ: کلیاتِ اقبال مرتبہ مولوی محمد عبدالرزاق حیدر آباد دکن: عماد پریس، ۱۹۲۴ء

❁ محمد اقبال، علامہ: کلیاتِ اقبال مرتبہ مولوی محمد عبدالرزاق (تعارف و تقدیم: ڈاکٹر فرمان فتح پوری)۔ لاہور: بیکن بکس، ۲۰۰۷ء

❁ محی الدین قادری زور، ڈاکٹر (مرتب): شاد اقبال۔ حیدر آباد دکن: سب رس کتاب گھر، ۱۹۴۲ء

رسائل و جرائد:

❁ اقبال ریویو، حیدر آباد دکن۔ جنوری ۱۹۶۶ء

❁ سب رس، حیدر آباد دکن۔ جون ۱۹۳۸ء

❁ مخزن، لاہور۔ جون ۱۹۱۰ء

(مطبوعہ ارمغان، رفیع الدین قادری ۲۰۱۲ء)

☆☆☆

ڈاکٹر عقیل ہاشمی
(سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی)

علامہ اقبالؔ اور فرزندان اسلام

علامہ اقبالؔ کی فکر اور اس کے مختلف زاویوں کے بارے میں یہ بات صاف پڑھی جاتی رہی ہے کہ اقبالؔ اپنے عہد کے ایک بہت بڑے اسلامی مفکر تھے اور ان کا فکری ماخذ قرآن، احادیث، نیز مشرق کے مسلم اکابر یا شیوخ تھے، یوں تو وہ مغربی فلسفہ کے طالب علم بھی تھے یوروپ کے جن مغربی فلسفہ کے اکابرین و اساطین سے استفادہ کیا تھا جو مشرقی علوم وفنون مسلم فلسفہ فقہ واصول سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اقبالؔ نے مغرب کی بہت ساری باتوں میں سے کچھ کو قبول اور کچھ کو مسترد کر دیا اور کچھ کو اپنے نقطۂ نظر کے مطابق پیش کیا۔ انہوں نے خود کہا ہے:

''میری زندگی کا بیشتر حصہ مغربی فلسفہ کے مطالعہ میں صرف ہوا اور یہ نقطۂ نگاہ میری فطرت ثانیہ بن گیا، شعوری اور غیر شعوری طور پر اسلامی حقائق میں صداقتوں کا مطالعہ اسی نقطۂ نگاہ سے کرتا ہوں'' (افکار اقبالؔ از عبدالسلام خاں، ص ۱۰۷)

یہ صحیح ہے کہ اقبالؔ کے افکار کی شروعات، شاعری سے ہوئی اور خطابت ہفت گانہ میں اس کی تکمیل نظر آتی ہے، ان کی شاعری میں جدوجہد کی تلقین، خودی، آفاقیت، وطنیت، قومیت مذہبی جوش، اعتقادی ولولہ، اسلامی خصوصیات یا نورانی تصورات کی تشکیل ملتی ہے، اقبالؔ کے ہاں مغربی فلسفہ ان کا تعلیمی میدان اور فلسفیانہ ترقی کا میلان تحقیقی محور رہا، اس کے علاوہ مسلمانوں کا ہمہ جہتی تنزل اور مغرب کی فعالیت اس کے ثمرات ان کے سامنے تھے۔ مغربی تہذیب اس کی مادی ترقی سائنسی ایجادات سے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے کی نظریں خیرہ ہو رہی تھیں۔ اقبالؔ نے بغیر کسی خیرگی اور مرعوبیت کے ان تمام امور کا انتقادی جائزہ لیا، ان کمزوریوں کی نشاندہی کی اور مقابلے میں اسلامی اصول ونظریات کی حمایت کی ان کے میلانات، رجحانات، خیالات وافکار کی ایک خاص روتھی جو روحانی اور عقلی اساس رکھتی تھی جو عمل اور حرکت کی متقاضی بھی، اسی مرحلہ پر انہوں نے اپنے کلام کے ذریعہ نوجوان نسل کو توجہ دلائی اپنے ابتدائی مجموعہ وبانگ درا کی نظم ''خطاب بہ جوانات اسلام'' میں ان اقدار عالیہ اور میراث مسلمانوں کی یاد دہانی کی ہے جسے نوجوان نسل فراموش کر چکی تھی۔

کبھی اے نوجوان مسلم تدبّر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارہ
تجھے آباء سے اور کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار تو ثابت وہ سیارہ
گنوادی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

اقبالؔ نے جہاں یہ احساس ذمہ داری یا پیام خودی کے ذریعے اس بات کی واضح کیا کہ خدانے قُران مجید میں انسان کی عظمت اس کی بزرگی نیز انفرادیت کو مستحکم کیا وہیں یہ بتایا کہ زندگی کی ہم آہنگی ایمانیات کی ذیل میں سے ہی انسان کی تقدیر ہے۔ اس کی تقدیر اس کا عمل وحرکت ہے' انسان خدا کا منتخب اوراشرف المخلوقات سے ہے نیز عمل کا دوسرانام انسان ہے۔ اگر جسم اعمال کے نظام کے تابع ہے تو روح اس کی تجربات کی خوگر اقبالؔ کے نزدیک اگر انسان کی خودی' خودی مطلق سے ہم آغوش ہوجائے اوراس کی انفرادیت باقی نہ رہے تب وہ ایک ایسی بلندی پر پہنچ جاتا ہے جہاں تقدیر انسان تقدیر یزداں بن جائے۔

تیرے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیر یزداں
توخود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے

اس منزل پراقبالؔ کے خیالات کا رفع بہت عظیم ہے۔ اقبالؔ نے قرآنی رو سے بتلایا کہ خدانے ساری چیزوں کی بناء اسی قدرت سے مربوط کردی۔ گویا ہرایک کے ساتھ اس کی تقدیر لگادی:۔

پابندئ تقدیر کہ پابندئ احکام
یہ سلسلہ مشکل نہیں اے مردخردمند
اک آن میں سوبار بدل جاتی ہے تقدیر
ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش ابھی خورسند
تقدیر کے پابند نباتات وجمادات
مؤمن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

شایداس لئے ایک اورمقام پر کہتے ہیں:۔

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا میرے آئینہ ادراک میں ہے

دراصل اقبالؔ کے یہاں غالباً ۱۹۱۲ء میں خودی پر فلسفیانہ افکارکی شروعات ہوچکی تھیں' ان کے روبرو مسلمانوں کا انفرادی واجتماعی زوال کُھل کرآ گیا تھا' ان پر یہ حقیقت بھی آشکار ہوچکی تھی کہ اسلام عصری ترقیات کا مخالف نہیں اورقرونِ اولیٰ کے مسلمان جواسلام کے سچے نمائندہ تھے دنیاوی ترقی کے لئے جدوجہد کو دینی امورکی پابجائی میں حارج نہیں سمجھتے تھے۔ان کے نزدیک مسلمانوں کا زوال وادبار کا بڑا سبب دولت مندی کی کمی نہیں بلکہ ذوق عمل سے محرومی تھی' ادھر برصغیر ہندوپاک میں اسلامی ڈھانچہ میں ہمہ اقسام کی بے اعتدالیاں' انحطاط فکروعمل' ایمانی وایقانی بے یقینی گھرچکی تھی۔ اقبالؔ مسلم معاشرہ میں اسلام کی تابندہ روح بیدارکرنے کے لئے اس پرضرب لگانے کوضروری خیال کرتے تھے' تب ہی توانہوں نے اپنی شاعری کی وساطت سے مسلمانوں خصوصاً نوجوانوں کومخاطب کرنے کی ٹھانی:

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کرگئی شاہین بچے کو صحبت زاغ
مِیری میں فقیری میں شاہی میں غلامی میں
کچھ کام نہیں بنتا بے جرأتِ رِندانہ
نظرکوخیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضرکی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ گاری ہے
راز اس آتش نوائی کا میرے سینے میں دیکھ
جلوۂ تقدیر مرے دل کے آئینہ میں دیکھ

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اورظلمت رات کی سیماب پا ہوجائے گی
شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز وساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہوجائے گی

اس خصوص میں اقبالؔ نے خودی کی تعمیر اور اس کی خصوصیات' زندگی سے اس کا تعلق اور خود زندگی کی بقا اس کا جماعت یا ملت سے ربط وضبط' عقلی اور روحانی استدلال' جذبہ عشق اس کی صداقت' مقصدیت کے سارے امور پر گفتگو کرتے ہوئے مختلف زاویوں سے اپنے کلام میں اشارے کنائے ہی نہیں بلکہ صاف اور واضح اشارے کئے۔ بقول عبدالسلام خاں:

''اقبال کی شاعری محض ادب اور انبساط نہیں بلکہ فکر انگیز اور مقصدی ہے جو روح میں بالیدگی ہی نہیں اس کو بیدار کرکے اس میں حوصلہ ولولہ اور عزم وہمت بھی پیدا کرتی ہے۔ اقبالؔ نے گوناگوں کئی طریقوں سے یہ باور کروانے کی کوشش کی ہے کہ انسان قدرت کا شہکار اور آفرینش کائنات کا اصل مقصود ہے۔ کائنات کی آرائش وزیبائش اس کے دم سے ہے۔ کائنات کی ساخت میں جو خرابیاں مضمر ہیں اور جو ناہم آہنگیاں اور فساد اس میں چھپے ہوئے ہیں ان کو دور کرنا اور ان کی اصلاح کرنا اس کا منصبی فریضہ ہے۔(افکار اقبال) ص:۱۰۲

اقبالؔ کے کلام کی ندرت اس کا کمال یہ ہے کہ وہ عصر حاضر میں کردار سازی کی جانب توجہ دلاتا ہے' مزید انہوں نے اپنے کلام میں انسانی تمدن اور معاشرہ کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کی خواہش رکھنے والے انسانوں کی رہنمائی اور اُن میں ایمانی تبدیلی کے نقطہ نظر کو بھی واضح کیا۔ اقبالؔ نے اس سلسلے میں تاریخ کی ان جھلکیوں کو پیش کیا جن کی شرح سے قلب وذہن مومن بیدار ہوجائے۔ اس بات کا اندازہ وہی کرسکتا ہے جس کی عام انسانی تاریخ یا پھر اسلامی تاریخ اور قرآن مجید کے علوم ومعارف پر وسیع اور گہری نظر ہو' نیز جنہوں نے یہودیت' عیسائیت' قدیم ہندوستانی مذاہب' فلسفہ وادبیات عجم اور قرونِ وسطیٰ کی تاریخ پر بھی نظر ڈالی ہو۔ قرون وسطیٰ جس کو یوروپ کے مورخ یا مغربی دانشور بجا طور پر قرون مظلمہ Dark Azes کے نام سے یاد کرتے ہیں' ان حقائق اور ان کی پردہ دری کے لئے اقبالؔ کی فکر رسا نے تطبیق سے زیادہ تقابل کا کام کیا۔ چنانچہ مغربی دنیا نے جاہ وحشم حکومت وامارت یا دنیاداری کو اختیار کرکے خود کو راضی اور مطمئن کرلیا اور اس میں ہمہ تن مشغول ہوگیا۔ انسانوں کی اکثریت نے دین ودنیا کے اس تضاد کے باوصف مذہب کو اہمیت نہ دی اور ایک ایسے معاشرہ کو فروغ دیا جس میں خدا بیزاری مقدم یا ناگریز ہوگی۔ اقبالؔ نے نہایت سنجیدگی علمی وقار وتمکنت کے ساتھ اس فرق وتفاوت پر روشنی ڈالی۔ بال جبریل میں فرماتے ہیں:

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی
سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی وراہبی میں
کہ وہ سربلندی ہے یہ سربہ زیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا
چلی کچھ نہ کلیسا کی پیری
ہوئی دین ودولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری ہوس کی وزیری

دوئی ملک ودیں کے لئے نامرادی
دوئی چشم تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشین کا
بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اَردشیری

اقبالؔ کی تصانیف اس امر کی گواہ ہیں کہ اقبالؔ نے **انما الاعمال بالنیات و انما الامرء مانویٰ** (تمام انسانی اعمال کا اعتبار اوران کا دارومدار نیتوں ہی پر ہے اور آدمی کو اس کی نیتوں ہی کے مطابق پھل ملتا ہے) کی اساس پر ملت کی رہنمائی کی۔ اس ضمن میں انہوں نے سب سے پہلے فرزندان اسلام سے اس بات کی آرزو کی:

دوا ہر دکھ کی ہے مجروح تیغ آرزو رہنا
علاجِ زخم ہے آزار احسانِ رفو رہنا

جبکہ نوجوانوں کی کیفیت یہ رہی:

اس چمن میں سراپا سوز و سازِ آرزو
اور تیری زندگانی بے گدازِ آرزو

اقبالؔ نے یہ بھی کہا:

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق ومغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا

اقبالؔ نے اعلیٰ تخیلات نے نوجوانوں کو ان کی منزلوں کی جانب صاف اشارے بھی کیئے:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
اگر کھوگیا اک نشیمن تو کیا غم
مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں
تو شاہین ہے پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہ ترے زماں اور مکاں اور بھی ہیں

اقبالؔ نے بتایا کہ گو انسان کے مادی وجود کا مانا جانا عناصر طبعی کے مجموعہ سے عبارت ہے لیکن ان عناصر کی تاریکی میں اس نے اپنے ذہنی شعور کی شمعیں روشن کی شمع روشن اور طبعی یا فطرت کے قوانین کی پابندی سے خود کو بے نیاز کرلیا' اس کا ذہن فعال اپنے ماسوا کائنات کی اشیاء کا علم حاصل کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے بلکہ خود مظاہر کا سبب بن گیا۔ یہی بات زندگی کو کائنات کی منفعل ہستیوں سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ پیمانۂ امروز وفردا سے آزاد رہ کر اشارہ کن فکاں کے اعلیٰ اوصاف سے متّصف بھی ہو جائے گا۔ زندگانی کی حقیقت کے بارے میں کہتے ہیں:

برتر اندیشۂ سودزیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانہ امروز فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم رواں ہردم رواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سیرآدم ہے ضمیر کن فکا ں زندگی
ملز م ہستی میں تو ابھرا ہے مانند حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

زندگی کا انفرادی اور اجتماعی پہلو ایک دوسرے سے اس قدر مربوط و وابستہ ہے کہ اسے صرف تجریدی طور پر ایک دوسرے سے الگ کرنا ممکن نہیں' فرد کی ذہنی نشو ونما کا دارومدار اجتماعی زندگی میں پوشیدہ ہے۔ انسان عمومی لحاظ سے کبھی اپنی خودی کو مطلق حیثیت سے محسوس کرتا ہے اور کبھی اس کی مرکزیت کھو جاتی ہے۔ ان دونوں میں تعاون اور توازن کو پیدا کرنے کی ضرورت ہوگی۔ فرد کی زندگی اس وقت قابل قدر اور بامعنیٰ بنتی ہے جب وہ تاریخ کے عمل و مرور کی قوتوں سے اپنا رشتہ استوار کرتی ہے۔ تاریخ سے علیحدہ ہو کر اس کی تکمیل ناممکن ہے' اس طرح انسانی حقوق و فرائض کی اخلاقی قدریں جماعت میں اور جماعت کے ذریعے ہی پوری ہو سکتی ہیں' شاید اسی کو روح عصر بھی کہا جاتا ہے۔ اقبالؔ نے بجا طور پر نئی نسل کے حریت پسند نوجوانوں کو بصیرت اور وجدان صحیح پر اکسانے کا کام انجام دیا۔ انہوں نے فرد کو ملت کے لئے اور ملت کو فرد کے واسطے لازم قرار دیا' فکر اقبالؔ کی رو سے اعلیٰ جماعتی نظام کا مقصد بلند قسم کے اشخاص پیدا کرنا ایک مقصد اور اعلیٰ ترین عمل ہوگا۔ انسانی ارتقا کا منتہا یہ ہے کہ فرد اور جماعت کے اقدار حیات میں ہم آہنگی پیدا ہو جو تمدن اس مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے وہی زندگی کی گتھیوں کو اچھی طرح سلجھانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں:

''فرد جب اپنے آپ کو ملت کے آئین وضبط کا پابند کرتا ہے اور غیر خود کی خدمت کو اپنا نصب العین بنا لیتا ہے تو اس وقت اپنے وجود کے بلند ترین مقام تک پہنچتا ہے' آدمی انسان اس وقت بنتا ہے جب وہ اپنی ذات کو اپنے مقصدوں سے وابستہ کرے جو اس کے وجود سے بلند تر ہوں۔ جو شخص با مقصد اور نیک زندگی بسر کرتا ہے وہ ساری انسانیت کے لئے اور سارے زمانے کے لئے زندگی گذارتا ہے۔ زندگی اس کے لئے جتنے وسیع معنی رکھتی ہے دوسروں کے لئے نہیں رکھ سکتی۔ انسانی مسرت اور کامجوئی کا راز خود غرض اور نفس پرستی میں نہیں بلکہ ایسے نصب العین کی دائمی اور متواتر تلاش اور جستجو میں مضمر ہے جو اپنی ذات کے سوا دوسروں کی بھلائی سے تعلق رکھتا ہو' مخلوق کی عام زندگی کے سوز و ساز میں شریک اور ایسی اقدار حیات کی تخلیق میں ممد و معاون ہونا جن سے اجتماعی مفاد وابستہ ہو حقیقی اخلاقی زندگی ہے''۔ (روحِ اقبال' ص:۱۹۶)

اقبالؔ نے اس ضمن میں دنیا کی مختلف قوموں کے عروج و زوال کا جائزہ لیا اور کہا کہ قرآن میں حق تعالیٰ نے قوموں کی بات ان کے کردار اور اعمال سے متعلق اپنا فیصلہ سنایا ہے ''وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ'' (اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو حاکم بنانے کا وعدہ کر لیا جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کئے جس طرح ان کے اگلوں کو اس نے حاکم کیا) گویا ''استخلاف فی الارض' کی شرط' عمل صالح ہے یعنی اِنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْن. (بے شک زمین صالح بندوں کی میراث ہے)۔ بالفاظ دیگر دنیا میں نیابت الٰہی ان ہی قوموں کو ملتی ہے جو اپنے فکر و عمل اور جذبہ تسخیر کی اہلیت رکھتی ہیں اور اپنے کردار نیز عمل صالح سے اپنی تقدیر کے راز معلوم کر سکتی ہے۔

رازہے راز تقدیر جہاں تگ و تاز
جوش کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز
صف جسگاہ میں مردان خدا کی تکبیر
جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز
اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورت فولاد
عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اُن کو اپنی منزل آسمانوں میں

اقبالؔ کی توقعات ہی نہیں آرزو ہے کہ اگر مسلمان اپنے آپ کو اسلاف کا سچا جانشین ثابت کردیں اور علم وعمل کو ترقی دے کر زندگی کو تابناک بنالیں تو پھر عزت، وقار وتمکنت کی دولت ان کے قدموں کو چومے گی۔عمل صالح کی اصل بنیاد زندگی کے وہ ابدی اور ناقابل تغیر اخلاقی اصول وقوانین ہیں جن سے انسان کے نفس کا تزکیہ ہوتا ہے، اس کی روح میں جلا پیدا ہوگی اور یہی انسانی حیات کا عروج وکمال ہے:

اگر جواں ہومری قوم کے جیسور وغیور
قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں

ایک اور مقام پر کہتے ہیں:

ولایت بادشاہی علم اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں فقط ایک نقطۂ ایماں کی تفسیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مردمومن سے بدل جاتی ہے تقدیریں

اقبالؔ نے اپنے کلام بلاغت نظام میں دانستہ اور شعوری طور سے عالم اسلام خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کو آگاہ وباخبر کیا ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد اصلی کیا ہے۔اپنی بیشتر نظموں میں قرآن اور حدیث کی روشنی میں اس حقیقت کو آشکارا کیا ہے:

یہی مقصود فطرت ہے یہی روز مسلماں
اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی

اقبالؔ نے نظم ''شکوہ'' میں حق تعالیٰ سے مسلمانوں کے تنزل وادبار کی شکایت کی اسلاف کے کارنامے گنائے، پھر خود ہی ''جواب شکوہ'' میں پروردگار عالم کی جانب سے اس کا واضح رد کیا۔شاعر کی شکایتوں کا جواب سماوی کا لبالب بجز اس کے کچھ اور نہیں کہ آج مسلمان نکبت وافلاس کے مارے عزت وعظمت سے محروم، اقوام لادین، شرک وبت پرستوں کے مظالم سے حیران وپریشان ہیں انہیں طرح طرح کی اذیتوں سے دوچار کیا جاتا ہے، ان سے نجات وچھٹکارا بظاہر محال وناممکن نظر آتا ہے، تو سن لیں خلاّق مطلق کا ازل سے یہ دستور رہا ہے کہ مستحق ہی کو سب کچھ ملتا ہے، صلاحیت وقابلیت کے لحاظ سے نعمت عطا کی جاتی ہے۔قاعدہ بھی یہ ہے کہ ڈھونڈھنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں۔شرط مانگنے والا ہو تو ہم مائل بہ کرم بھی ہوں گے:

عدل ہے فاطر ہستی کا ازل سے دستور
مسلم آئین ہوا کافر تو ملے حور و قصور
تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰ ہی نہیں

اسی طرح نظم ''طلوع اسلام'' میں تفصیل مرد مومن کی شان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ضمیر لالہ میں روشن چراغ آرزو کردے
چمن کے ذرے ذرے کو شہید جستجو کردے

یا پھر اس جرأت آموزی کی طرف توجہ دلاتے ہیں: ۔

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

علامہ اقبال نے فرزندان اسلام سے ایمانی حرارت ایقانی جوش وولولہ کردار سازی، عمل صالح کی زندگی اپنانے کی خواہش کی اور کہا کہ ارتقاء حیات کا عین مقصد اخلاقی وروحانی بالیدگی، پاکیزہ کا فروغ ہے، زندگی کا مظہر درحقیقت ذہنی اظہار کا ارتقاع ہے۔ زندگی اور ذہن ایک ہی چہرہ کے دو نام ہیں اور زندگی کوئی بنی بنائی شئے نہیں۔ اس میں ہر آن، ہر گھڑی، ہر دم نئی نئی خواہشوں کے تحت تغیرات کا پابند ہونا لازمی ہے، یہ فعالیت کا ارتکاز ہے جو ہمیشہ سفر میں ہے اور منزل پر کبھی نہ پہنچنے کا طریق بھی:

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
وجود کیا ہے فقط جوہرِ خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود تیرا
وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کی رگ و پئے میں فقط مستی کردار

ان تمام باتوں کے لئے اقبال نے ایک ''حکمت کثیر'' کی جانب نشاندہی کی اور یہ کچھ اور نہیں عشق الٰہی ہے جو یقیناً الکتاب سے حاصل ہوگا:

آں کتابِ زندہ قرآن حکیم
حکمت او لایزال است و قدیم
حرف اوٗ را ریب نے تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
نوعِ انساں را پیامِ آخریں
حامل او رحمتہ للعالمینؐ
گر توی خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

انہوں نے علم اور عشق کے فرق وامتیاز کو بھی سمجھایا۔ اس ضمن میں کئی اشعار پڑھے جاسکتے ہیں:

تازہ میرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰ عقل تمام بولہب

علم عشق کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ پیر رومیؒ سے اکتساب کرتے ہوئے ضرب کلیم کی نظم ''علم وعشق'' میں کہتے ہیں:

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین وظن
بندۂ تخمین و ظن کرم کتابی نہ بن
عشق سراپا حضور علم سراپا حجاب
عشق سکون وصفات عشق حیات وممات
علم سے پیدا سوال عشق سے پنہاں جواب
عشق کے ہیں معجزات سلطنت فقر دیں
عشق کے ادنیٰ غلام صاحب تاج نگیں
عشق مکان و مکیں عشق زماں و زمیں
عشق سراپا یقیں اور یقیں فتح یاب

شرح محبت میں ہے عشرت منزل حرام
شورش طوفاں جلال لذت ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال، عشق پہ حاصل حرام
علم ہے ابن الکتاب عشق ہے ام الکتاب

اقبالؔ کو اس بات کا رنج وقلق رہا کہ مسلمانوں کو حکمت دین کی تعلیم کا دینے والا کوئی نہیں، بدقسمتی سے قرآن حکیم سے استفادہ کرنے اسی سے نورانیت حاصل کرنے شوق وشغف جاتا رہا۔ حتیٰ کہ بدبختی کا یہ عالم کہ قرآن کے معنیٰ ومفہوم کو بدلنے کی سعی وکاوش ہوتی ہے:

ہند میں حکمت دیں کوئی کہاں سے سیکھے
نہ کہیں لذت کردار نہ افکار عمیق
خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

مردمومن کی شان کے بارے میں ان کے افکار عالیہ ملاحظہ ہوں:

ہرلحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری وغفاری وقدوسی وجبروت
یہ چارعناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایہ جبریل امین، بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارانہ بدخشاں
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

قدرت کے مقاصد کا عیار، اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان
جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
فطرت کا سرورِ ازلی اس کے شب وروز
آہنگ میں یکتا صفت سورۂ رحمان

ایک آخری بات جو ''اقبال نے اپنی معرکتہ الآرا تصنیف'' جاوید نامہ ۱۹۳۲ء (فارسی) میں کی ہے، اس کتاب کی ابتداء یوں تو مناجات سے ہوتی ہے جس میں اقبالؔ نے اپنی بصیرت افروزی کے چراغ روشن کئے ہیں اور ایک مثالی گہر باریقین علم وعمل کی دنیا بنانے کی دعوت دی ہے۔ بقول سید احمد ایثار مترجم کلام اقبال:

''اس میں شکوۂ تنہائی بے کیفی ایام اور حقائق اشیاء تک نارسائی کا تذکرہ ہے۔ ساتھ ہی روشن ضمیر کے لئے تڑپ اور حیات جاودانی کی آرزو کی گئی ہے۔ بظاہر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کچھ خود اپنے لئے ہے لیکن اس کے آخری بند سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نعمتیں آپ نے قوم کے لئے اور خصوصاً آنے والی نسلوں کے لئے مانگی ہیں اور اس میں تمام بنی نوع آدم کی بہبودی کا سامان ہے''۔ (جاوید نامہ ص ۵۰)

گویا خطاب یہ جاوید (سخنے بہ نژادنو) علامہ اقبالؔ کے فرزندان اسلام توقعات کا مرکز ومحور سے جدا نہیں ہے:

نہیں ناامید اقبالؔ اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

☆☆☆

ڈاکٹر قطب سرشار
14-5-208/22 بھگیر تھا کالونی،
محبوب نگر 001 509 تلنگانہ

فکر اقبال کا بنیادی مآخذ

اقبال کے بارے میں اقبال شناسوں نے مختلف آراء کا اظہار کیا ہے۔ ادبی حلقوں نے انھیں ایک عظیم دانشور آفاقی شاعر اور عہد آفریں مفکر تسلیم کیا ہے تو مذہبی حلقوں میں اقبال کو افکار اسلامی کا مجتہد مانا گیا۔ تاہم ادبی و مذہبی دونوں حلقوں نے اس بات سے بھی اتفاق کیا ہے کہ فکر اقبال قلندرانہ انکشافات کی نمائندہ ہے۔ سیاست دانوں نے ایک مخصوص مذہب کو فکر اقبال کا محور قرار دیتے ہوئے اقبال کی آفاقیت کو محدود اور مجروح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ادھر مغربیوں نے (بجز پروفیسر آرنلڈ) اقبال کو موافق اسلام اور مخالف مغربی افکار و تہذیب باور کیا ہے۔ یہاں ان ساری باتوں سے قطع نظر ہم نے اقبال کے اشعار کو کتاب و سیرت اور علم تصوف کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ یعنی کسی بحث میں الجھے بغیر براہ راست اقبال کی سوچ اور سوچ کے مآخذ تک رسائی کی ایک جہت کو اختیار کرتے ہوئے فہم اقبال کے اسرار کو پانے کی سعی کی ہے۔ ہمارا مقصد بس اتنا ہے کہ فکر اقبال کو براہ راست ''ذہن ساز شعری اظہار'' ثابت کرتے ہوئے یہ عرض کریں کہ اقبال، قوموں کو اقبالیات کے لٹریچر کا عالم نہیں، بلکہ صاحب عمل بنانا چاہتے ہیں۔ یا پھر یوں کہا جا سکتا ہے کہ کلام اقبال کی فہم اانسان کو معتقد اقبال یا معترف اقبال نہیں بلکہ ''مقلد اقبال'' بنا دیتی ہے۔

فکر اقبال کا بنیادی مآخذ کتاب وسیرت ﷺ اور صوفیانہ زاویہ نظر ہے۔ ان تینوں مآخذ کے خمیر سے اقبال کے ایمان و ایقان اور نظریہ حیات کی تشکیل و تعمیر ہوئی ہے۔ فکر اقبال نہ ہی فلسفہ ہے اور نہ سائنس۔ چونکہ فلسفہ ایک تخلیقی اور تاثراتی حقیقت ہے اور سائنس عقل اور منطق پر انحصار کرتی ہے۔ جبکہ قرآن و سنت عقل انسان سے ماوری علم و آگہی اور نظم زندگی کے رہنمایانہ خطوط فراہم کرتے ہیں۔ ان کے وسیلے سے افراد کی ذہنی تربیت کے ساتھ ساتھ قوموں کے مابین اتحاد واخوت کے امکان روشن ہو جاتے ہیں۔ اس طرح امن عالم کا قیام یقینی ہو جاتا ہے۔ علم و آگہی نظم زندگی کے رہنمایانہ خطوط فراہم کرتے ہیں۔ ان کے وسیلے سے افراد کی ذہنی تربیت کے ساتھ ساتھ قوموں کے مابین اتحاد واخوت کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔ علم و آگہی اور تہذیب و تمدن کے مرحلے میں آج کی دنیا خود کو نہایت ترقی یافتہ مانتی ہے۔ اور یہ حقیقت بھی سب پر عیاں ہے کہ دنیا کے اس علم و آگہی اور تہذیب و تمدن نے

عالمی سطح پر انتشار، تشکیک، نفاق تشدد اور وحشت کو جنم دیا ہے۔ زندگی کا حسین ترین چہرہ پوری طرح مسخ ہو چکا ہے۔ آج کا حساس انسان زندگی جی نہیں رہا ہے بلکہ سانسوں کا قرض چکا رہا ہے۔ ایسے دور میں فکر اقبال کی تفہیم و تشہیر کے باعث یقین ہے کہ زندگی کے زخموں کا امداد ہو جائے گا۔ انشاء اللہ۔

میری دعا ہے تیری آرزو بدل جائے

اس لمحے جب انسان کا ارادہ ٹوٹ جاتا ہے آرزو مجروح ہو جاتی ہے۔ کچھ پانے کے لئے طویل جدوجہد کے بعد بھی ہاتھ کچھ نہیں آتا بلکہ رہا سہا بھی لٹ جاتا ہے' ضائع ہو جاتا ہے، گم ہو جاتا ہے۔ کچھ بھی باقی نہیں بچتا۔ مسکراہٹوں اور مستیوں میں گھرا ہوا انسان ناگاہ کسی شدید کسی جانی، مالی اخلاقی تباہی کا سامنا کر جاتا ہے۔ جب اپنے پرائے ہو جاتے ہیں۔ صحت بیماری میں، نفع نقصان میں، اجالا اندھیرے میں، راحت مصیبت میں بدل جاتی ہے، محبتوں کے دمکتے چہروں سے نفرتوں کے شعلے لپکنے لگتے ہیں۔ قہقہے آہ و بکا میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ قوموں، ملکوں، ملتوں اور سماجوں کے رنگ ڈھنگ اور اعتبارات و نظریات بدل جاتے ہیں۔ پرامن جنگلوں کے پیڑ کٹنے لگتے ہیں۔ انسان جامہ انسان کو پھاڑ کر نکل پڑتا ہے' پھر درندگی اور بربریت کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ خون کی ندیاں بہنے لگتی ہیں۔ بچوں، عورتوں، بے بس نفوس کی چیخوں کے دھویں سے آسمان سیاہ ہونے لگتا ہے۔ قحط، سیلاب، وباؤں، مہنگائی اور ظالم حکمرانی کے تسلط سے عام آدمی کا عرصہ حیات تنگ ہو جاتا ہے۔ تب انسان ساری باتوں کو نحوست، پیر فلک کا قہر، مقدرات اور ستاروں کی گردش مان کر ان سے بچنے کی خاطر خالق کائنات سے رحم اور پناہ مانگنے لگتا ہے یعنی وہ اپنے خالق، حاکم، مالک اور رب سے براہ راست مخاطب ہو جاتا ہے۔ ہم انسان کی رب سے اس مخاطبت کو ''دعاء'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس لمحہ دعا میں بندہ اپنے رب سے بہت قریب ہو جاتا ہے۔ اسی لئے تو دعا کو افضل عبادت کہا گیا اور اللہ کو دعا عبادتوں میں سب سے زیادہ پسند ہے۔ دعاؤں کے مرحلے بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ دعاؤں کے نتائج نہایت شیریں، تلخ و ترش اور شدید مایوس کن بھی ہوتے ہیں۔ دعا، دراصل مسائل کے حل کے لئے انسانی بارگاہ الٰہی میں نمائندگی ہوتی ہے۔ دعائیں، مسائل کی فہرست جیسی ہوتی ہیں۔ ایسا بہت کم ہوا' اور ہوتا ہے کہ بندے نے دعا کی اور اللہ نے بیک وقت سارے مسائل کی یکسوئی کردی ہو۔ دعا جب قبول ہی نہیں ہوتی یا پھر دعا کے بعد بھی وہی ہو جاتا ہے جو انسان نہیں چاہتا۔ اس مرحلے پر عوام کس طرح ردعمل کرتے ہیں اور اقبال کیا سوچتے ہیں اور کہتے ہیں۔

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے

دعائیں جب مقبول ہو نہیں پاتیں تو انسان یقیناً بدل جاتے ہیں' کردار بدل جاتا ہے' عقیدہ بدل جاتا ہے' ایقان بدل جاتا ہے۔ نتیجتاً انسانی رویہ اور سماجی ڈھانچہ بدل جاتا ہے۔ چونکہ انسان کو بہر قیمت اپنے مسائل کا حل نکالنا ہے' وہ ''دعا'' کو بدل نہیں دیتا بلکہ اپنے آپ کو بدل لیتا ہے یا غیر محسوس طور پر بدل جاتا ہے۔ اس بدلاؤ کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں' وہ ٹوٹ جاتا ہے۔ یاسیت اور احساس کمتری اس کے

وجود میں جذب ہونے لگتے ہیں ۔ بوکھلا کر خود کو شا کر و صابر ظاہر کرنے لگتا ہے۔اس دوہرے رویے کے باعث اس کا کردار پگھلنے لگتا ہے۔پگھل پگھل کر رفتہ رفتہ جھوٹ اور استحصال کے سانچوں میں ڈھلنے لگ جاتا ہے ۔اس کا چہرہ اس قدر بدل جاتا ہے کہ اسے اصلی اپنی شکل یاد نہیں رہ جاتی:۔

مگر ہے اس یہ ممکن کہ تو بدل جائے

اقبال نے لفظ ''بدل'' کے تحت بدلاؤ کے جن امکانات کا یقین ظاہر کیا ہے اس سے مراد چہرے کی گمشدگی ، یاسیت یا قانون انسانیت سے انحراف کی صورت میں ہرگز نہیں ۔ بدلاؤ سے مراد اقبال کے ہاں اللہ کی مشیت سے راضی ہوجانا یعنی اپنی مرضی اپنی خواہش اورضرورتوں کو اپنے منصوبوں کو منصوبہ الٰہی کے موافق کردینا ہے ۔اقبال کی نظر میں یہی صحت منداورسلامتی والا بدلاؤ (انقلاب) ہے ۔اس صحت مند انقلاب کو اس طرح ممکن بنایا جاسکتا ہے کہ دعا سے پہلے انسان یہ مان کر چلے کہ جو میں چاہتا ہوں وہ میرے نفس اور عقل کی پیداوار ہے اور دعا کے بعد جو کچھ سامنے آجائے وہ قدرت کا فیصلہ ہے جو خیر ہی خیر ہے ۔ بیدالخیر (خیر اللہ کے ہاتھ میں ہے)۔ یہ باتیں تو سبھی جانتے ہیں ،یقیناً جانتے ہوں گے لیکن کتنے ہیں جو مانتے بھی ہیں ۔ مانتے اس لئے نہیں کہ اس جاننے اور ماننے کے بیچ ''مسابقی جذبہ'' اور ''نفع وضرر'' کا نظریہ حائل رہتا ہے ۔مسابقتی جدبے کے زیر اثر انسان خوب سے خوب تر کی اور دوسروں جیسا بلکہ دوسروں سے بہتر اور بالاتر ہوجانے کی سمت چلنے لگتا ہے ۔ یہ خوب اور خوب تر کا تعین اللہ نے کتاب مبین میں چودہ سو سال پہلے کردیا ہے ۔خیر اور شر کا تعین کرنا عقل انسانی کے بس کا روگ نہیں ہے ۔تعینات صفات الٰہی کے محرومات کا دوسرا نام ہے اور صفات الٰہی انسان کے سرحد ادراک سے آگے کی باتیں ہیں۔

سماجی ڈھانچے انسانی عقل ،مشاہدوں اور تجربوں سے تشکیل پاتے ہیں جس کے نتیجے میں عقائد روایات مفروضات عمرانی زندگی کا شعار بن جاتے ہیں ۔لیکن مومن سماج کا مقلد نہیں ہوتا' اپنے رسول کا ہوتا ہے ۔زندگی میں نفع ونقصان کا تصور انسان کی عقل مشاہدوں اور تجربوں سے پیدا ہوتا ہے لیکن مومن کی نظر میں نفع ونقصان کا تعین اس کی عقل کے میزان پر نہیں ہوتا بلکہ قرآن کے میزان پر رسول اللہ ﷺ کے قول وفعل کے میزان پر ہوتا ہے۔ ''زمانے کی قسم ! بے شک انسان خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے ،جو (۱) ایمان والے (اللہ کے قانون کو ماننے والے) ہیں' (۲) جو نیک عمل کرتے ہیں' (۳) جنہوں نے آپس میں حق کی وصیت کی' (۴) جنہوں نے آپس میں صبر کی نصیحت کی (قرآن مجید ،سورۃ العصر)۔اس سورۃ کے ذریعہ خالق کائنات نے نفع اور نقصان کا واضح لفظوں میں تعین کردیا ہے یعنی فرد ہو کہ ملت ایمان ،عمل صالح حق اور صبر سے محروم ہوجائے تو خسارے میں ہے ۔ اس کا مطلب ہوا ان چار اوصاف کے سوا باقی تمام ''متاع دنیا'' سے محرومی خسارہ اور ہزیمت ہرگز نہیں ہے ۔متاع دنیا کا تصرف عرصہ حیات تک محدود ہے اور زمین پر فتنہ وفساد کا سبب بھی ۔جبکہ ایمان ، عمل صالح حق اور صبر دنیا میں امن وسلامتی، مہرمروت ،

انصاف ومساوات کا وسیلہ ہیں اور ''متاع آخرت'' بھی۔

''اثر کرے نہ کرے سن تو لے میری فریاد

نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد''

اس شعر میں ایک مدعا ہے اور اس مدعا میں جو لہجہ دھڑکتا ہے وہ نہایت کرب واضطراب کا حامل ہے۔ بنیادی الفاظ ہیں اثر، فریاد، داد، اور بندۂ آزاد۔ مدعا کو ''فریاد'' سے تعبیر کرتے ہوئے اپنی آواز کی جانب توجہ کے طالب ہیں۔ بات جو وہ کہنا چاہتے ہیں اس کی اثر آفرینی سے پر امید نہیں ہیں تو ناامید بھی نہیں ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ بات قابل توجہ ہے اور لائق تحسین بھی۔ اقبال نے طلب داد کی نفسیات سے ماوریٰ اور بے نیاز ہوکر اثر پذیری کی ''امید'' اور داد طلبی'' سے خود کو بالکلیہ آزاد کرلیا ہے۔ اقبال کے یہاں لفظ آزاد (حر) نے ایک مخصوص مفہوم کا نمائندہ اس لفظ نے مستقل اصطلاح کی حیثیت اختیار کرلی ہے اور یہ اصطلاح اقبال کے ذہن میں ''قرآنی شعور'' کے زیر اثر وضع ہوئی ہے۔ اقبال کی ذہنی ساخت اور فکری توانائی، قرآن میں تفکر اور تدبر کے نتیجے میں صاحب قرآن کی جانب سے عطا کردہ ''وہبی نعمت'' ہے جسے عرف عام میں ''القا کہا جاتا ہے۔ اقبال نے قرآن مجید سے جو آگہی حاصل کی ہے اس کو وہ ''خودی'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اقبال کی خودی کو ہم تربیت، ضمیر، تصفیہ نفس، تزکیہ نفس یا پھر ''تقویت انا'' جیسی ادبی وصوفیانہ اصطلاحوں کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کرسکتے ہیں۔ اقبال کے لفظ ''بندۂ آزاد'' کے وسیلے سے ایک ایسے کردار کا تعارف ہوتا ہے جو حرص وہوس، غم وغصہ، خواہشات ومفادات، خوف ورجا سے بے نیاز اور آزاد ہے۔ اس منفرد نوعیت کے کردار یعنی بندۂ آزاد نے اپنے نفس کو پوری طرح قانون فطرت سے ہم آہنگ کررکھا ہے۔ یہ بندۂ آزاد نفس کی تمام آلائشوں کو پوری طرح قانون فطرت سے ہم آہنگ کررکھا ہے۔ اس بندۂ آزاد، نفس کی تمام آلائشوں سے پاک ہوکر ''وما علینا الا البلاغ'' کا حق ادا کررہا ہے گویا ایک ''ذہن رسا'' ہے جو آگہی کا قطار لئے اذہان عالم کو صلائے عام دے رہا ہے تاہم وہ اپنے لہجے کو ملتجیانہ بناتے ہوئے دل گداز لہجے میں کہتا ہے ''سن تو لے میری فریاد''!

اقبال سے پہلے لفظ فریاد مظلوموں، بے کسوں، مجبوروں کا نمائندہ رہا ہے۔ اقبال نے اس لفظ فریاد میں اخلاص، ہمدردی اور کرب وخیرخواہی سمو کر لفظ میں خوش گوار معنوی توانائی پیدا کی ہے۔ عقل انسانی اور آگہی کے درمیان ''نفس'' حائل ہے اور نفس احکامات، اصول وضوابط، پند ونصائح اور قید وبند سے عموماً کترا تا رہتا ہے۔ لیکن مہر ومروت، خلوص اور نرم گداز لہجوں سے پسیج جاتا ہے اور اقبالؔ اس نوع کی نفسیات انسانی سے بہ خوبی آگاہ معلوم ہوتے ہیں۔ عجب نہیں کہ اقبال کی فریاد سماعتوں سے گزر کر عقل کو مہمیز کرے اور احساس کو مرتعش کردے۔ اقبال کو بس اپنی بات کہنی ہے کہ اس کے آگے وہ کسی اور ردعمل (Re-action) کے متمنی نہیں ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ ان کی بات رائیگاں نہیں جائے گی، کیونکہ یہ بات شاعری ہے نہ فلسفہ، تحقیق ہے نہ تنقید، فکشن ہے نہ فکاہیہ بلکہ انسانی عقل اور اس کے تجربوں، مشاہدوں اور پرواز فکر سے بالاتر ہوکر ''عرفان ذات الٰہی'' ہے۔ یعنی عروج آدم خاکی کے

''رازہائے سربستہ'' ٹوٹے ہوئے تارے کے بے سمت سفر کو جہت حقیقی کا شعور عطا کرتے ہیں۔

علم کا حاصل:

وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں
جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کف جو

اقبال کی نظر میں وہ علم جس کا حاصل محض دو مٹھی جو کہ دانے ہوں۔احرار کے حق میں زہر کی تاثیر رکھتا ہے۔اس شعر میں ''علم''، ''علم''، ''زہر''، ''احرار' اور'' دو کف جو'' جیسے الفاظ کو کلیدی حاصل ہے۔سب سے پہلے ہم علم کی گتھی سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔علم ایک نور ہے جس کی روشنی ''صراط مستقیم'' پر چلتی ہے۔علم کے بغیر عقل بے سمتی کا شکار ہوکر بھٹکنے لگتی ہے۔عقل کی حالت اس اندھے کی مانند ہوتی ہے جو لامسہ سامعہ اور حافظے کی مدد سے راستوں کا تعین کرتا ہے' انوار علم سے عقل کو بصارت ملتی ہے۔اس روشنی میں عقل راستوں کی پہچان اور تعین کرنے لگتی ہے۔علم کی افادیت آفاقی ہوتی ہے۔اس افادیت کو رزق وروزی کے محدود دائروں میں مقید کردینا حریت پسندوں کے حق میں ''زہر ہلاہل'' سے کم نہیں۔اسی لئے اقبال نے علم کی محدود افادیت کے تصوراحرار کے حق میں سم قاتل قرار دیا ہے لفظ احرار اقبال کا استعارہ ہے۔یہ احرار کون ہیں اس سوال کا جواب جانے بغیر شعر کا مضمون بڑا پیچیدہ ہوجائے گا۔

دو کف جو کے دانے تو زندگی کی بقا کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔یہاں اقبال نے کوئی غیر فطری یا حقیقت کے منافی بالکل بات نہیں کہی ہے۔اور نہ ہی حصول روزگار کی مساعی کو قطعی غیر ضروری مانا ہے۔دراصل حصول علم کی جدوجہد کوئی مزدوری نہیں ہے' اک فطری جستجو ہے۔اس جستجو کے نتیجے میں جو ہاتھ آتا ہے وہ نہ صرف طمانیت بے پناہ ہے بلکہ نور بصیرت بھی۔جبکہ حصول رزق وروزی کی خاطر علم حاصل کرنے والوں کی نظر میں علم مقصد نہیں بلکہ محض ذریعے کی حیثیت رکھتا ہے۔ایسے لوگوں کی تمام تر توجہات علم پر کم اور حصول روزگار پر زیادہ ہوتی ہیں۔اس طرح وہ علم کی اہمیت اور افادیت سے قطعی بے علاقہ ہوکر صرف معاشی استحکام اور تعیّشات کے دائرے میں الجھنے لگتے ہیں۔انہیں دائروں میں مفاد پرستی، حرص وہوس بے حسی انتشار، انا پروری، حسد وانتقام اور دنیا کی اندھی تقلید جیسے مہلک جراثیم پنپتے ہیں۔انہیں سے ایک بے سمت اور غیر یقینی کلچر وجود میں آتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اقبال نے محض فکر معاش کو بقائے انسانیت کے حق میں مہلک قرار دیا ہے اور عصر حاضر کے عقیدے میں فکر معاشی ہی پر حیات انسانی کی بقا ہے۔دراصل یہ تضاد اک واضح تضاد کا فکر کا نتیجہ ہے روٹی کپڑا مکان اگر زندگی کی بنیادی ضرورتیں ہیں تو ان کے ساتھ بلکہ ان سے آگے تعیّشات حیات شان وشوکت نمود ونمائش نفسانی خواہشات کا ایک طویل سلسلہ ہے۔جو عصر حاضر کی معاشرتی زندگی کے لوازمات کی حیثیت اختیار کرچکے ہیں:

عصر حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکر معاش

فکر معاش سے مراد اقبال کے یہاں روٹی کپڑا اور مکان اوران سے جڑے ہوئے دیگر لوازات بھی ہیں علم وہنر کو اللہ نے بقائے انسانیت اورارتقائے حیات کے ضامن قرار دیا ہے جس قوم کا سرمایہ علم وہنر ہوتے ہیں اس کے لئے معاشی استحکام کے سامان ازخود پیدا ہو جاتے ہیں ۔حصول علم کو فکر معاش سے جوڑ دینا جستجوئے علم کو فنا کر دینا ہے ۔پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعاؤں میں ہمیشہ اللہ سے علم صالح اور علم نافع کی مانگ کی ہے ۔یعنی علم کی دو اقسام ہوئیں: ایک نفع پہنچانے والا علم دوسرا نقصان پہنچانے والا علم ۔علم نافع کے ذیل میں دستور حیات اور حیات وکائنات کے اسرار کھولنے والے علوم بھی شامل ہیں ۔

قرآن وسنت دستو رحیات ہیں اورحیات وکائنات کے ذیل میں زندگی کے داخلی اور خارجی حقائق کے انکشافات ہیں ۔عصر حاضر نے تمام تر علوم کو معاش سے مربوط کرر کھا ہے ۔اقبال نے علم کو فکر معاش سے مربوط کرنے کو مہلک قرار دیا ہے ۔احرار حُر کی جمع ہے یعنی آزاد لوگ ۔گویا سماج میں دوطرح کے لوگ ہوتے ہیں: آزاد اورغلام ۔آزاد وہ جو حرص وہوس ،غم وغصہ ،حسد وانتقام ،شہوت ودہشت اور مفاد پرستی کی گرفت سے آزاد ہوتے ہیں یا پھر ان صفات کو اپنی گرفت میں رکھنا جانتے ہیں ۔جو تقلید زمانہ کے سیل میں بہتے ہوئے خس وخاشاک کی طرح بہہ نہیں جاتے بلکہ بذات خو دسیلاب ہوتے ہیں اورزمانہ جن کی زد میں ہوتا ہے ۔ان کی نظر و میں فکر معاش کوئی مسئلہ نہیں ایک محدود ضرورت کی تکمیل سے زیادہ اہم نہیں ۔صدر اول کے مسلمانو ں نے فاقے کئے حددرجہ معمولی لباس زیب تن کیا‘ پکے مکان نہیں بنوائے اورکبھی دولت ، حکومت اورشان وشوکت کے حصول کو مقصد حیات نہیں بنایا۔انہوں نے حصول علم کو فرض جانتے ہوئے اسے بقائے انسانیت اورارتقائے حیات سے مربوط کردیا ۔عصر حاضر جس کی صورت گیری فرنگ کرتا ہے ساری دنیا کو فکر معاش کے دلدل میں پھنسانے کا ہنر جانتا ہے ۔چنانچہ اقبال ہمیں خبردار کرتے ہیں کہ محض معاشی ارتقاء کے پیش نظر حصول علم کی روش احرار کی کردارکشی کے سامان مہیا کرتی ہے ۔علم اگر بقائے انسان کا وسیلہ نہیں بنتا ہے تو مال تجارت بن جاتا ہے ۔تجارت انسان کو دولت مند بنادیتی ہے سعادت مند نہیں ۔اقبال رزق کو معنویت آب ودانہ کی حدتک محدود نہیں سمجھتے بلکہ ان کی نظر میں فیوض علم بھی رزق ہے ۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

کیا میں نے اس خاکدان سے کنارا
جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ

اقبال کے منفردکردار احرار، پاکیزہ ضمیر، نگاہ بلند اورمستی شوق جیسی اعلیٰ صفات کے حامل ہیں ۔انہیں نہ مال کی نہ دولتِ قارون کی ہوس ہے ۔اورنہ افکارافلاطون سے شغف!

ضمیر پاک ونگاہ بلند ومستی شوق
نہ مال ودولت قاروں، نہ فکرافلاطون

☆☆☆

ڈاکٹر رؤف خیر
حیدر آباد

اقبالؔ کے فکر و فن کا گراف

میں نے اس سے پہلے بھی اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ادب، آرٹ، شعر یا اسلوب کی جامع تعریف کرنا حروفِ مقطعات کے معنے تلاش کرنے کے برابر ہے۔

فی الحال ہمارا سروکار اسلوب سے ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اسلوب ہی شخصیت ہوتا ہے۔ Style is the Person۔ مگر شخصیت تو شکست و ریخت کے عمل سے گزرتی رہتی ہے۔ شخصیت کے ذہنی ارتقا کے ساتھ ساتھ اس کا انداز بھی بدلتا رہتا ہے۔ رہن سہن اور لکھنے پڑھنے میں بھی نمایاں تبدیلی آتی رہتی ہے۔

اسلوب کی تشکیل و تعمیر میں تخیل، انتخابِ موضوع، لفظیات اور رویّہ Treatment اپنا اپنا حصہ ادا کرتے ہیں۔ اسلوب یعنے Diction ہی فن کار کی پہچان ہے۔

اردو کے ہر قابلِ ذکر شاعر کے بارے میں کہا جاتا رہا ہے کہ نو دس برس کی عمر ہی سے کلام موزوں اس کی زبان سے نکلنے لگا تھا۔ سر عبدالقادر کے بیان کے مطابق اقبال کا بھی یہی حال تھا۔ ظاہر ہے نو دس برس کی عمر میں جیسے کچھ شعر کہے جاتے رہے ہوں گے وہ نوجوانی میں کچھ اور ہو جائیں گے اور پھر تجربہ و مشاہدہ کے ساتھ ساتھ فکر و فن میں پختگی آنا لازمی ہے۔ یہ راز غیر سر بستہ (Open Secret) ہے۔ اقبال بھی ایسی ہی منزلوں سے گزر کر علامہ اقبال ہو گئے۔

ابتدا میں اقبال اکبر الہ آبادی سے بہت متاثر رہے۔ ان کے فکر و فن کے اس قدر گرویدہ تھے کہ ان کی پیروی تک کرنے لگے۔ اقبال کے ظریفانہ کلام کا یہ حال ہے کہ انہیں اکبری اقبال کہا جانے لگا۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِّ نظر
وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ
اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

اقبال کے یہ دو شعر ملاحظہ فرمایئے اور نوجوانوں کی صورتِ حال ذہن میں لائے:

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں
مفت میں کالج کے لڑکے اُن سے بدظن ہو گئے

وعظ میں فرمادیا یہ آپ نے کل صاف صاف
پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے

اس موقع پر اکبرالہ آبادی کا وہ مشہور قطعہ بھی یاد کیجیے:

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

ooo

اقبال کوئی اکبرالہ آبادی ثانی بننے کے لیے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ اس بات کا احساس خود اکبر نے اقبال کو کرایا اور انہیں اپنا رنگ آپ اپنی ڈگر آپ نکالنے کا مشورہ دیا اور کہا ''چلتا نہیں کام نقالی سے''

پھر یوں ہوا کہ اقبال نے ''ہمالہ'' کو اپنی فکر کا سنگِ بنیاد بنایا۔ جس فکر وفن کی بنیاد ہی ہمالہ پر رکھی گئی ہو اس کے متزلزل ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ یہ نظم ''مخزن'' اپریل 1901ء میں شائع ہوئی جب اقبال کی عمر چوبیس سال تھی:

اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
تو جواں ہے گردشِ شام وسحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لیے

آٹھ بندوں پر مشتمل مسدس کی ہئیت میں کہی ہوئی اس نظم کی تان اس شعر پر ٹوٹتی ہے:

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح وشام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

وہ مسدس جو انیس ودبیر کی خاندانی جاگیر ہو کر غمناکی کی علامت ہوگئی تھی اب اقبال پسندی نے اُسے سرخ روکیا۔ ''ہمالہ'' سے لے کر شکوہ۔ جوابِ شکوہ تک اسی ہئیت میں اقبال نے اپنے اسلوب کے ارتقا کا کمال دکھایا۔ اقبال کی بعض ابتدائی شاہ کار نظمیں مسدس ہی کی ہئیت میں ہیں۔ ہمالہ کے بعد گل رنگیں، عہد طفلی، مرزا غالب ابر کوہسار، آفتابِ صبح، نالہ فراق (آرنلڈ کی یاد میں)۔ شکوہ، جواب شکوہ تک اقبال نے اس ہئیت کو نئے نئے موضوعات سے ہم کنار کر کے اس کو نئی زندگی بخشی۔ اقبال کے اسلوب کا ارتقا دراصل اقبال کا ذہنی ارتقا بھی ہے۔ اب مسدس محض کربلائی واقعات کی رنگ آمیزی کا نمونہ نہیں رہ گئی تھی بلکہ اسے خواجہ الطاف حسین حالی نے ''مدوجزر اسلام'' کے اظہار کے لیے چن کر نیا وقار بخشا' پھر علامہ اقبال نے شکوہ جوابِ شکوہ کے ذریعے اسے نئی بلندیوں تک پہنچایا:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے
قدسی الاصل ہے رفعت پہ نظر رکھتی ہے
خاک سے اٹھتی ہے گردوں پہ گزر رکھتی ہے
عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک مرا
آسماں چیر گیا نالہء بے باک مرا
منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک

حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

ooo

اقبال نے مرثیے بھی لکھے جیسے ان کا پہلا مرثیہ مرزا غالب کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے کہا گیا:

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کُجا
تھا سراپا روح تو، بزمِ سخن پیکر ترا
زیبِ محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ کو اس حُسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شئے میں جو مستور ہے

ooo

اقبال نے اپنی والدہ مرحومہ کا جو مرثیہ لکھا وہ بجائے خود ایک شاہ کار فلسفیانہ نظم ہے:

تخمِ گل کی آنکھ
زیرِ خاک بھی بے خواب ہے
کس قدر نشو ونما کے واسطے بے تاب ہے

اور یہ طویل مرثیہ اس دعائیہ شعر پر اختتام پذیر ہوتا ہے:

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

سرسید، حالی، شبلی، آرنلڈ وغیرہ کی مثالیں بھی سامنے ہیں جن کے لیے اقبال نے مرثیے لکھے۔

ہئیت کے حوالے سے بات کی جائے تو مثنوی کو بھی اقبال نے دیومالائی اثر سے آزاد کرایا۔ من گھڑت قصے ہی مثنوی کی پہچان تھے۔ امانت، شوق، میر، میرحسن، دیاشنکر نسیم وغیرہ۔ میر صاحب نے اژدرنامہ لکھ کر خود کو اژدہا اور دیگر شعراء کو حشرات الارض تک قرار دیا تھا۔ مگر اقبال نے ''ساقی نامہ'' لکھ کر مثنوی میں فکر و فلسفہ کی ایک دنیا رکھ دی:

حقیقت خرافات میں کھوگئی
یہ امت روایات میں کھوگئی
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے
یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات
خودی جلوہِ بدمست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

ooo

اس طرح اقبال نے مثنوی جیسی ازکار رفتہ ہئیت کو ایک زندہ فلسفہ سے آشنا کیا۔ فارسی میں جو کچھ شاہ کار چھوڑے وہ الگ ہیں۔ فی الحال ہم اردو کی اصناف تک خود کو محدود

رکھتے ہیں۔

علامہ اقبال نے طویل نظمیں لکھیں جن کا ایک ایک شعراُن کی اعلیٰ فکر کا غماز ہے۔ جیسے ذوق وشوق' مسجد قرطبہ:

صدقِ خلیل بھی ہے عشق ،صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر وحنین بھی ہے عشق

لوح بھی تو قلم بھی تو ، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ ، تیرے محیط میں حباب

اس نظم میں انسان ،کائنات ،عشق ،زندگی سب پر اظہارات ہیں۔اسی طرح مسجد قرطبہ میں وقت کے فلسفے کو پیش کیا گیا ہے جواپنی جگہ مکمل موضوع ہے:

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات
سلسلہ روز و شب اصلِ حیات و ممات

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کارِ جہاں بے ثبات ،کار جہاں بے ثبات

اول و آخر فنا' باطن و ظاہر فنا
نقشِ کہن ہو کہ نو منزلِ آخر فنا

نقش ہیں سب نا تمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام ،خونِ جگر کے بغیر

اقبال نے جہاں طویل نظمیں کہی ہیں وہیں دو دو تین تین شعر کی نظمیں بھی کہہ کر اپنی بات رکھ دی ہے۔جیسے''خودی کی تربیت''

خودی کی پرورش وتربیت پہ ہے موقوف
کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ ہمہ سوز

یہی ہے سرِ کلیمی ہر اک زمانے میں
ہوائے دشت وشعیب وشبانیِ شب و روز

دو دو تین تین چار چار اشعار تو دور کی بات ہے اقبال کا ایک ایک شعر بھی ایک ایک نظم کی حیثیت رکھتا ہے:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

000

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

چار چار مصرعوں میں بھی اقبال نے اپنی فکر انڈیل کر رکھ دی ہے۔ پیامِ مشرق میں ''لالۂ طور'' یا ارمغان حجاز کے قطعات تو مثال میں پیش کیے جا سکتے ہیں ۔جنھیں اقبال نے رباعیات کا نام دیا ہے مگر ہم اردو کی حد تک اقبال کے اسلوب کے پابند ہیں:

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے

صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

000

خدائی اہتمام خشک و تر ہے
خدا وندا خدائی دردِ سر ہے

ولیکن بندگی ۔ استغفر اللہ
یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

اصناف وہیئت کے اعتبار سے اقبال کے اسلوب کے ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی بعض نظموں کے اندرون میں اتریں تو اقبال کا فکری انقلاب بھی دکھائی دیتا ہے۔ جیسے نظم

''نیا شوالہ'':

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

مگر پھر اقبال نے اس فکر سے ہاتھ اٹھا لیے:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اسی طرح ترانۂ ہندی:

سارے جہاں سے اچھا ہندستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اب نیا روپ دھارتا ہے جو علاقائیت سے آفاقیت کی طرف سفر کا استعارہ:

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

ہر چند کہ فی الحال اقبال کے اردو شاہ کاروں کے حوالے سے گفتگو کی جاری ہے پھر بھی گوئٹے کے دیوانِ مغرب (West Osticher Divan) مطبوعہ 1819 کے تقریباً ایک سو برس بعد علامہ اقبال نے ''پیامِ مشرق'' پیش کر کے یہ اس کے سرنامے پر لکھ دیا ''وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِب '' کہ مشرق و مغرب کی فرماں روائی کا حق صرف اللہ واحد ہی کو ہے۔

دانتے کی طربیۂ خداوندی Divine Comedy کے بالمقابل ''جاوید نامہ'' جیسی بڑی لکیر کھینچ کر اپنے تخیل کو حسّی پیکر میں ڈھال کر دکھا دیا۔ اقبال نے اس میں شک نہیں دانتے، گوئٹے کے علاوہ نطشے و برگساں جیسے مغربی فلسفیوں سے استفادہ کیا مگر اپنی مشرقی حیثیت کو متاثر ہونے نہیں دیا۔ اس موقع پر بارگاہِ الٰہی میں اقبال کی یہ جسارت بھی قابلِ داد ہے:

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

برگساں نے کہا تھا کہ انسان کی کاری گری، قدرت کو اک حسنِ اضافی دیتی ہے۔ محراب گل افغان ہو کہ ابوالاعلی معری یا رومیؔ اقبال نے اخذ و اختیار کے ساتھ ساتھ رد و قبول کا اسلوب اپنایا۔ مشرق و مغرب کے کسی بڑے سے بڑے فلسفی و ادیب کی ذات میں وہ گم نہیں ہو جاتے بلکہ اپنی شناخت بہرصورت قائم رکھتے ہیں۔ وہ چاہے بچوں کے لیے نظمیں لکھیں کہ بڑوں کے لیے جس کسی سے کوئی خیال اٹھاتے ہیں اس کا ذکر کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ یہی اقبال کی اعلی ظرفی ہے جیسے بھرتری ہری سے اٹھایا ہوا خیال ایک بے مثال شعر میں ڈھل گیا۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

ooo

اقبال کی مکالماتی نظمیں جبریل و ابلیس، ابلیس کی

مجلس شوریٰ جگنو و پروانہ وغیرہ بھی اقبال کے تخیل ،موضوع ، لفظیات اور پیرایۂ اظہار Treatment اسلوب کے شناس نامے ہیں۔

جہاں تک زبان و بیان کا معاملہ ہے اقبال کی انفرادیت ایک ایک مصرعے سے بولتی ہے۔''مخزن'' میں شائع ہونے والی اقبال کی ابتدائی غزلیں فطری اظہار کا نمونہ ہیں:

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

مخزن (جون 1901ء)

لاؤں وہ تنکے کہاں سے آشیانے کے لیے
بجلیاں بے تاب ہوں جن کے جلانے کے لیے

مخزن (نومبر 1901ء)

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں

دکن ریویو (1904ء)

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

مذکورہ چند شعر ''بانگِ درا'' کے حصہ اول سے پیش کیے گئے ہیں۔ حصۂ دوم (بانگِ درا) میں اقبال کی فکر کا گراف اونچا اٹھتا محسوس ہوتا ہے اور وہ داغ دہلوی کے اثر سے نکلتے دکھائی دیتے ہیں:

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا
دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

بانگِ درا کے تیسرے حصے میں یہ اسلوب اور پختہ و منفرد ہوتا گیا:

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں
تو بچا بچا کہ نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں
جو میں سر بہ سجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

بال جبریل کی ابتدائی سولہ غزلیں منفرد بھی ہیں اور مسلسل بھی۔ اس میں جو فکر ہے وہ انفرادیت لیے ہوئے بھی ہے اور ایک اندرونی تسلسل خیال کی حامل بھی۔ ان سولہ غزلوں کا جائزہ بجائے خود ایک مضمون کا متقاضی ہے۔ پہلی غزل کا پہلا شعر ہے:

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں

اور سولھویں غزل کا ایک شعر ہے:

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی ، نہ صفاہاں نہ سمر قند

پھر ایک سے اکسٹھ (یعنے سولہ کا الٹا) غزلیں ایسی ہیں جن میں اقبال مختلف قوافی میں اپنے آپ کو بارگاہ الٰہی میں پہنچا کر کبھی خود کلامی، کبھی مخاطبت تو کبھی ڈرامائی کیفیت سے گزارتے ہیں:

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی
تن آسا عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

ان اکسٹھ غزلوں میں اقبال نے جہاں انسانوں کی رہبانیت گوشہ نشینی اور زمینی زندگی سے عدم دل چسپی کو نشانہ بنایا ہے وہیں محض زمین ہی سے جڑی رہنے والی بے آسماں ارضیت پر بھی چوٹ کی ہے:

سمجھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہم جوار اپنا
ستارے جن کے نشیمن سے ہیں زیادہ قریب

ooo

پھر ضرب کلیم کی دو اک غزلیں عام روش سے ہٹی ہوئی ملتی ہیں۔

اقبال کی غزل کا ہر شعر بجائے خود اک نظم ہے۔ایک ایک شعر کی شرح کرنے والوں نے اپنے اپنے طور پر اس میں الگ جہانِ معنی تلاش کیے ہیں ۔صرف ان کی غزلوں کے حوالے سے اقبال کے اسلوب کا ارتقا پیش کیا جا سکتا ہے۔ان کے فکر وفن کا گراف اوپر سے کبھی نیچے نہیں آتا۔

جہاں تک تصوف کا معاملہ ہے اقبال جزرومد کا شکار ہیں۔کبھی یہ تصوف کے خلاف باضابطہ نوٹس Notes جمع کرتے دکھائی دیتے ہیں جنھیں کراچی کے پروفیسر صابر کلوروی نے ''تاریخ تصوف'' کے نام سے 1985ء میں شائع کردیا ہے۔

یورپ کے لیے رختِ سفر باندھنے والا اقبال نظام الدین اولیا کے مزار پر ''التجاے مسافر'' کے ساتھ حاضری بھی دیتا ہے۔شیخ احمد سرہندی کے مزار پر اولادِ نرینہ کے لیے دعا کرتا ہے اور دس سال بعد بیٹے کے ساتھ منت پوری کرتا ہے۔

سید فصیح اللہ کاظمی کے نام ایک خط مورخہ 14رجولائی 1919ء کو اقبال لکھتے ہیں:

''تصوف کے متعلق میں خود لکھ رہا ہوں۔میرے نزدیک حافظ کی شاعری نے بالخصوص اور عجمی شاعری نے بالعموم مسلمانوں کی سیرت اور عام زندگی پر نہایت مذموم اثر کیا ہے۔ اسی واسطے میں نے ان کے خلاف لکھا ہے۔مجھے امید تھی کہ لوگ مخالفت کریں گے اور گالیاں دیں گے لیکن میرا ایمان گوارا نہیں کرتا کہ حق بات نہ کہوں۔شاعری میرے لیے ذریعۂ معاش نہیں کہ میں لوگوں کے اعتراضات سے ڈروں...''

(مشمولہ خطوطِ اقبال مرتبہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی بحوالہ تاریخ تصوف مکتبۂ الحسنات دہلی،ایڈیشن 1989ء)

مگر یہ بھی ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اقبال نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے چونتیس 34 اشعار کا وہ بند نکال دیا جس میں حافظ شیرازی کے زہریلے اثرات سے قوم کو خبردار کیا گیا تھا اور اس کے مسلک کو گوسفندی قرار دیا گیا تھا کیوں کہ خواجہ حسن نظامی نے اقبال کا پیچھا کیا۔اسی زمانے میں اقبال یہ اعتراف کرتے بھی دکھائی دیتے ہیں:

''مجھے اس امر کا اعتراف کرنے میں کوئی شرم نہیں کہ میں ایک عرصے تک ایسے عقائد و مسائل کا قائل رہا جو بعض صوفیہ کے ساتھ خاص ہیں اور جو بعد میں قرآنِ شریف میں تدبر کرنے سے قطعاً غیر اسلامی ثابت ہوئے۔مثلاً شیخ محی الدین ابنِ عربی کا مسئلہ قدمِ ارواحِ کملاء،وحدت الوجود یا مسئلہ تنزلاتِ ستّہ ۔ مذکورہ بالا تینوں مسائل میرے نزدیک مذہبِ اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے''

(وکیل ۱۵رجنوری 1916۔بحوالہ ''تاریخ تصوف'')

☆☆☆

ڈاکٹرمحمد اسلم فاروقی
صدرشعبۂ اُردو
گری راج کالج نظام آباد (تلنگانہ)

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر

دنیا میں جب جب ظلمت کے اندھیرے چھا جاتے ہیں تو اپنے دور کی ظلمت کو دور کرنے کے لیے اپنے جیسے ہی سیدھے سادھے انسانوں میں سے عظیم شخصیات کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ وہ شخصیات ہوتی ہیں جو اپنی فکر سے زمانے کی تاریکی اور ظلمت کے اندھیروں کو دور کرتے ہوئے علم و عمل کی روشنی عام کرتی ہیں اور اپنی فکر کو رہتی دنیا کے فائدے کے لیے چھوڑ جاتی ہیں۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کی ابتدائی تین دہائیوں میں انگریزوں کی غلامی سے جدوجہد کرتے ہندوستان اور سارے عالم کو اپنی مفکرانہ اور مدبرانہ شاعری سے جس شخصیت نے روشنی دکھائی وہ شاعرمشرق علامہ اقبالؔ تھے۔

شیخ محمد اقبالؔ (1873-1938) اردو کے عظیم مفکرشاعر گذرے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ قومی اور وطنی جذبہ کو ابھارا۔ خودی عشق اور حرکت و عمل کے فلسفے کو انہوں نے فنکاری کے ساتھ پیش کیا۔ اقبالؔ مرد مومن میں ان صفات کو پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اقبالؔ کے شعری مجموعے بانگ درا' بال جبرئیل' ضرب کلیم اور ارمغان حجاز ہیں۔ کلام اقبال کی خاص بات یہ ہے کہ ان کے ہر ہر شعر سے رہتی دنیا کو حرکت و عمل کا پیغام ملتا ہے۔ اگر کوئی ان کے ایک شعر کو بھی اپنی عملی زندگی میں لالے تو اس کی زندگی سنور جائے۔ ایک ایسے دور میں جب کہ دنیا میں خیر اور اچھائی اجنبی ہوتی جارہی ہے اور ہر طرف مادہ پرستی' ظلم و جبر اور لاقانونیت کی فضا عام ہے۔ نوجوان بے عمل ہوتے جارہے ہیں اور دنیا کو سیدھا راستہ دکھانے کے لیے بھیجی گئی امت مسلمہ کے نوجوان مغرب پرستی کی روش پر چلتے ہوئے اپنی دنیا و آخرت برباد کررہے ہیں۔ اقبال کی شاعری ہمیں اپنے نوجوانوں کو سیدھا راستہ دکھانے اور انہیں دنیا میں انقلاب برپا کرنے کا اہل بناتی ہے۔ جب ہم اقبال کی حیات کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنے سفر انگلستان کے موقع پر اپنے فرزند جاوید اقبال کے نام ایک جذباتی نظم لکھی تھی۔ جس کا پہلا مصرعہ ''دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر'' حرکت و عمل کی نصیحت کرنے میں ضرب المثل بن گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ انتہائی بلیغ نظم اقبال نے اپنے فرزند جاوید اقبال کے ہاتھ کا پہلا لکھا ہوا خط پڑھنے کے بعد لکھی تھی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال اپنی تصنیف ''زندہ رود'' میں لکھتے ہیں کہ:

''1932ء میں جب گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے ابا جان انگلستان گئے تو اس وقت میری عمر کوئی سات سال کے لگ بھگ تھی۔ میں نے ایک اوٹ پٹانگ سا خط لکھا اور خواہش ظاہر کی کہ جب وہ واپس تشریف لائیں تو میرے لئے ایک گراموفون لیتے آئیں۔ گراموفون تو وہ لے کر نہ آئے لیکن میرا انہیں انگلستان میں لکھا ہوا خط ان کی نظم ''دیار عشق میں ۔۔۔کی شان نزول کا باعث ضرور بنا''۔

چنانچہ اس نظم میں اول سے آخر تک شفقت کا رنگ نظر آتا ہے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اقبال اپنے فرزند میں کیا کیا خوبیاں دیکھنا چاہتے تھے۔ بظاہر اس نظم میں انہوں نے اپنے فرزند جاوید اقبال کو مخاطب کیا ہے لیکن باطن میں اس نظم کے پیغام کا اطلاق تمام فرزندان ملت پر ہوتا ہے۔ کیوں کہ اقبال ملت کے رہبر تھے۔ انہوں نے پوری زندگی مسلمانوں کی اور عالم اسلام کی رہبری میں بسر کی۔ وہ ساری عمر ملت کے غم میں تڑپتے رہے۔ اور اسی تڑپ کا نتیجہ تھا کلام اقبال کی شکل میں ایک بیش قیمت سرمایہ ہماری وراثت میں چھوڑ گئے۔ ایک زمانے تک اقبال ہندوستان میں معتوب تھے۔ حالانکہ انہوں نے ترانہ ہندی جیسی نظم لکھ کر ہندوستان پر بڑا احسان کر دیا۔ لیکن آزادی کے بعد ہندوستان میں اقبال کا نام لینے کو جرم سمجھا جاتا تھا۔ تاہم آل احمد سرور اور جگن ناتھ آزاد جیسے ماہرین اقبالیات نے ایک مرتبہ پھر اپنی تحریروں سے فکر اقبال کو ہندوستان میں متعارف کرایا۔

اور آج ہر سال اقبال کے یوم پیدائش اور یوم وفات پر خصوصی تقاریب کا انعقاد کرتے ہوئے ہم فکر اقبال سے روشنی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اقبال کی نظم دیار عشق میں ۔۔ کے اشعار کے مفہوم پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس نظم کا پیغام بہتے دریا کی طرح ہر زمانے میں رواں ہے اور آج بھی ہم اس سے فیض حاصل کر سکتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں:

دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

ooo

اقبال اپنے فرزند سے فرماتے ہیں کے اے جاوید اگر اللہ تجھے توفیق عطا کرے تو اللہ کی محبّت میں خود کو فنا کر کے حیات جاوید حاصل کر لے۔ اگر تو نے یہ راستہ اختیار کر لیا تو یقیناً تجھ میں یہ صلاحیت پیدا ہو جائے گی کہ تو دنیا میں انقلاب پیدا کر دے گا۔ اقبال کے نظام افکار میں تخلیق عالم نو کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ان کے فلسفہ اور پیغام کی خاصیت ہی یہی ہے کہ مسلمانوں میں یہ قوت پیدا ہو جائے کے وہ نیا زمانہ اور نئی دنیا پیدا کر سکیں۔ یہ نئی دنیا کیا ہے۔ یا اس سے ان کی کیا مراد ہے۔ اقبال کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح نبی اکرم ﷺ نے اسلام کے ذریعے نئی دنیا پیدا کر دی تھی اور دنیا میں سب سے بڑا انقلاب بر پا کر دیا تھا، اسی طرح حضور ﷺ کے غلام بھی حضور ﷺ کے نقش قدم پر چل کر دنیا میں انقلاب پیدا کر سکتے ہیں۔ انقلاب اس کے سوا کیا ہوگا کہ مسلمان دنیا کو جو اس وقت تاریکی

میں غرق ہے قرآن حکیم کی تعلیمات سے روشناس کردیں۔ یہ دنیا جائے عشق ہے۔یعنی عشق کے سبب ہی یہاں ہر طرح کی حرکت وعمل ہے۔اگر انسان حرکت وعمل ترک کردے تو وہ بے جان ہوگا۔اقبال نوجوانوں سے امید رکھتے ہیں کہ وہ اپنے اندر حرکت وعمل کی چنگاری پیدا کریں اوراس دنیا میں اپنی آمد کے مقصد پر کاربند ہوجائیں۔ ہندوستان کی تاریخ شاہد ہے کہ محمد بن قاسم کے بعد یہاں بیشتر مسلم حکمران آئے اور انہوں نے اپنی فراست اور جستجو سے حکمرانی کی اعلی مثالیں پیش کیں۔اقبال نے جس طرح کہا کہ ''نیا زمانہ نئے صبح وشام پیدا کر''۔اسی طرح ہمارا ماضی شاندار ہے لیکن حال مایوس کن ہے۔اورہمیں فکر اقبال پر عمل پیرا ہوکر اپنے مستقبل کو تابناک بنانا ہے۔مسلمانوں کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کے ساتھ ساتھ تعلیم کو اپنا زیور بنائیں۔کیا بات ہے کہ ایک زمانے میں سائنس‘ طب‘ جغرافیہ اور دیگر علوم میں دنیا کو نیا فلسفہ دینے والے مسلم سائنسدان آج ناپید ہیں۔ کیوں کہ ہم نے مادہ پرستی اختیار کرلی ہے اور دنیا کی امامت کا سبق بھول بیٹھے ہیں۔ آج کا نوجوان وقت بربادی کے نئے نئے مشاغل میں ڈوبا ہوا ہے جب کہ مسلمانوں سے سیکھے ہوئے سبق کو پڑھ کر مغربی اقوام دنیا کے ہر محاذ پر ترقی کررہی ہیں۔اس لیے اقبال کا پیغام واضح ہے کہ یہ دنیا دارالعمل اور دارعشق ہے‘ یہاں وہی لوگ کامیاب ہوسکتے ہیں جو اپنا نام اور مقام رکھتے ہیں۔یہ دنیا انہی لوگوں کو مقام دیتی ہے جن کے اندر کچھ صلاحیت ہو۔ اور دنیا کے عام انسانوں سے ہٹ کر کچھ کرنے والے ہی نیا زمانہ بناسکتے ہیں۔ہمارے پاس پیش کرنے کے لیے چند مثالیں ہیں لیکن اقبال چاہتے ہیں کہ امت مسلمہ کا ہر فرد اسوہ نبوی ﷺ پر کاربند ہوکر دنیا میں انقلاب برپا کردے۔اپنی نظم میں اقبال آگے کہتے ہیں:

خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو
سکوت لالہ و گل سے کلام پیدا کر

ooo

یعنی اگر اللہ تجھ کو مطالعہ فطرت کا ذوق عطا کرے تو تجھے لالہ وگل سے اس ہستی کا ثبوت مل سکتا ہے۔ سکوت لالہ وگل سے کلام سے مراد اگرچہ یہ ہے کہ وہ زبان نہیں رکھتے لیکن اگر کوئی فطرت شناس ان کی بناوٹ پر غور کرے تو وہ زبان حال سے خالق کائنات کے وجود پر گواہی دیں گے۔اقبال کا پیغام واضح ہے کہ انسان کو حصول علم میں یہ بھی کرنا ہے کہ خدا کی بنائی ہوئی کائنات میں غور وفکر کرنا ہوگا۔انسان خود خالق کائنات کی قدرت کا عظیم مظہر ہے جسے خدا نے قوت گویائی دی۔اٹھارہ ہزار مخلوقات میں اسے اشرف بنایا اور کائنات پر حکومت کرنے کی صلاحیت دی۔اقبال کہتے ہیں کہ ہمیں خدا کی بنائی ہوئی کائنات میں غور وفکر کرنا چاہئے۔دنیا میں جو کچھ ایجادات ہورہی ہیں وہ اسی غور وفکر کا نتیجہ ہے۔اللہ نے اس کائنات میں بے شمار راز پوشیدہ کردیے ہیں اور انسان کو زندگی دے کر یہ موقع دیا ہے کہ وہ ان سربستہ رازوں سے پردہ چاک کرے اوراپنے لیے اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے

لیے کچھ کر جائے۔ آج اقبال کے شاہین حرکت وعمل اور فکر وعرفان کی روشنی سے دور ہیں تو وہ مغرب کی ایجادات سے مستفید تو ہو رہے ہیں لیکن کبھی ہم نے نہیں سنا کہ کسی مسلمان نے سائنس کی دنیا میں کوئی بڑی ایجاد کی ہو۔ جب کہ مواقع سب کے لیے یکساں ہیں۔ اس لیے اقبال اپنے بیٹے کے ذریعے دنیا کے نوجوانوں کو یہ پیغام دے رہے ہیں کہ وہ خدا کی ذات کا عرفان حاصل کریں اور اس کی قدرت سے اپنے لیے کارآمد چیزیں حاصل کرلیں۔ اقبال اس نظم میں آگے نوجوانوں کو ایک اہم مشورہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:

اٹھا نہ شیشہ گران فرنگ کے احسان
سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر

ooo

شیشہ گران فرنگ سے مراد یورپ کی وہ قوتیں مراد ہیں جو عیاری ور مکّاری میں مشہور ہیں۔ شیشہ گر کے لغوی معنی ہیں کانچ کے برتن بنانے والے کے۔ ان الفاظ کو اقوام مغرب کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان قوموں کے اصول زندگی پائدار نہیں۔ نیز ان کے معاہدے کانچ کے برتن کی طرح کمزور ورنا قابل اعتبار ہیں۔ ان کے علوم وفنون اور خیالات میں بھی پختگی نہیں ہے اور افادیت نہیں پای جاتی۔ یہ اصطلاح ان کی پوری زندگی پر صادق آسکتی ہے۔ احسان نہ اٹھانے سے مراد یہ ہے کہ ان کی تہذیب اور ان کی معاشرت مت اختیار کرو۔ ان کے افکار ورخیالات کو مت قبول کرو۔ جو علوم و فنون انہوں نے ایجاد کیے ہیں ان کو بیشک استعمال کرو لیکن ان اقوام کی تقلید مت کرو۔ اس شعر میں اقبال نے پائیدار ترقی کا بنیادی ضابطہ بیان کردیا کہ مغرب کی تہذیب کی نقالی نہ کی جائے۔ کیوں کہ مغرب کے بتائے طریقہ زندگی فانی ہیں۔ مغرب نے بھلے ہی ہمیں حیرت انگیز ایجادات دیئے ہیں لیکن ان کی تہذیب سے انسانی اخلاق کو شدید نقصان پہونچتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ مغرب کی اندھی تقلید کرتے ہوئے اپنے مشرقی اقدار کو کھو چکا ہے۔ آج ہمارے نوجوان فیشن اور طرز زندگی میں مغرب کی نقالی کرتے ہیں اور ناکام ہو کر پھر کسی سکون والے راستے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جب کہ ہماری مٹی ہماری تہذیب میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ ہمیں حقیقی چین وسکون فراہم کرسکے۔ دیسی دِدیسی کا یہی معاملہ ہے۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے معمار گاندھی جی نے بھی ہمیں یہی سبق پڑھایا تھا کہ ہم مغرب کی ترقی کا احسان نہ اٹھائیں بلکہ اپنے وسائل سے اپنے وطن کی تعمیر کریں۔ اقبال نظم کے آگے کہتے ہیں:

میں شاخ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر

ooo

یعنی کلام اقبال خوشہ انگور ہے۔ اس خوشہ سے مئے لالہ فام پیدا کرو کا مطلب یہ ہے کہ میرے کلام کے مطالعہ سے اپنے اندر مذہبی و ملی و سیاسی شعور پیدا کرو۔ اقبال کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی کہ ان کے افکار

سے ہم فائدہ اٹھائیں لیکن اقبال کو کہنا پڑا کہ اس دور کا اور آج کے دور کا نوجوان غفلت کی نیند سو رہا ہے۔ کامیابی کی کلید فکرِ اقبال اور فکرِ اقبال کے منبع قرآن و حدیث کی شکل میں ایک بیش قیمت ہیرے کی طرح ہمارے سامنے ہے لیکن ہمیں اس سے استفادے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ فکرِ اقبال کو اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی پیش کیا جائے اور موجودہ دور کے ذہین طالب علموں کو اس فکر سے روشناس کرانے کی کوشش کی جائے۔ اقبال کی اس نظم کا آخری شعر اس نظم کی جان ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

ooo

یہ شعر اس نظم کی جان نہیں بلکہ تمام کلام کی جان ہے' اقبال کے سارے فلسفہ کی روح ہے۔ اپنی خودی کو کسی بھی قیمت پر مت بیچو۔ خودی خود آگہی کا دوسرا نام ہے۔ اگر انسان، حرص دینوی سے قطع ونظر کر کے غور و فکر سے کام لے تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح اس پر واضح ہو سکتی کہ غریبی میں بھی نام پیدا کیا جا سکتا ہے۔ انسان عزت اور شہرت ہی حاصل کرنے کے لیے اپنی خودی کو بیچتا ہے۔ اور اس کے عوض دولت حاصل کرتا ہے۔ اگر انسان ہمت و استقلال سے کام لے تو غریبی میں ہی نام پیدا کر سکتا ہے لہذاا نام پیدا کرنے کے لیے ضمیر فروشی کی ضرورت نہیں۔ ہر زمانے میں کچھ ضمیر فروش لوگ گزرے ہیں جو اپنے ضمیر کا سودا کرتے ہوئے اپنا اور قوم کا مستقبل برباد کر دیتے ہیں۔ اسی لیے اقبال اپنے شاہینوں سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ ہر حال میں اپنے تشخص کو برقرار رکھیں اور اس کا سودا نہ کریں۔ موجودہ سیاست میں لوگ ذاتی اور وقتی فائدے کے لیے اپنی خودی کا سودا کرتے نظر آتے ہیں۔ جو پانی کے بلبلے کی طرح کچھ عرصہ منظر عام پر رہتے ہیں پھر فنا ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے ترقی کی راہ یہی ہے کہ انسان غریبی میں محنت و مشقت اور راست بازی سے اپنا نام پیدا کرے۔

کلام اقبال کے یہ اشعار ملک کے مستقبل کی امید سمجھے جانے والے نوجوانوں کے لیے ہر زمانے میں مشعل راہ ثابت ہوتے ہیں۔ اقبال کی اس فکر کو عام کرنا ہماری اخلاقی اور ملی ذمہ داری ہے۔ کیوں کہ موجودہ زمانے میں نوجوان اعلی تعلیم کی ڈگریاں تو حاصل کر رہے ہیں لیکن کردار سازی میں صفر ہونے کے سبب ان کی تعلیم نہ ان کو فائدہ دے رہی ہے نہ ملک وقوم کو۔ اقبال نے ہی اپنے نوجوانوں سے پر امید ہو کر کہا تھا۔

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

☆☆☆

رُباعی

ترا تن روح سے نا آشنا ہے
عجب کیا آہ تیری نارسا ہے
تنِ بے روح سے بیزار ہے حق
خدائے زندہ زندوں کا خدا ہے

علامہ اقبال

ڈاکٹر محمد ابرارالباقی
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو
شاتاواہانا یونیورسٹی کریم نگر (تلنگانہ)

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں!

اقبال بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ تاہم ان کی بیشتر نظمیں غزل کی ہیئت میں ملتی ہیں۔ اقبال نے جس وقت شاعری شروع کی تھی اس وقت غزل کے روایتی سفر کے ساتھ ساتھ انجمن پنجاب کے زیر اثر نظم گوئی کو فروغ مل رہا تھا۔ اقبال بھی اسی نظم گوئی تحریک کا سلسلہ ہیں۔ انہوں نے شاہکار نظمیں کہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اقبال نے اردو غزل کی روایت کی پاسداری بھی کی۔ لیکن بعد میں وہ اپنے مخصوص رنگ میں غزلیں کہنے لگے۔ ان کے پہلے شعری مجموعے بانگ درا میں کل ستائیس غزلیں ہیں جب کہ بال جبریل میں غزلوں کی تعداد کچھ زیادہ ہے۔ اقبال نے جس دور میں غزلیں کہیں اس وقت استاد داغؔ کا چرچا تھا یہی وجہ ہے کہ اقبال نے بھی داغؔ سے اصلاح لی تھی۔ اقبال چونکہ ایک فطری اور جینئس شاعر ہیں اسی لئے انہیں غزل کے روایتی رنگ سے چھٹکارہ حاصل کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ اسی لئے اردو غزل کو انہوں نے جو کچھ دیا اس سے غزل میں ایک نئی زبان، نئے مضامین اور نئے اسلوب متعارف ہوئے۔ ویسے غزل کی اصلاح کا کچھ کام اپنے محدود دائرے میں حالؔی نے اقبال سے پہلے ہی کیا تھا حالؔی کی جدید غزلوں کے گہرے مطالعے سے اقبال کے لہجے کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اقبال نے داغؔ سے عشق کے موضوعات اور لطف زبان سیکھی لیکن فکری وفنی سطح پر وہ حالی سے زیادہ قریب ہیں۔ ان کی غزل میں سوز و ساز کے ساتھ جمال کی مستی، جذبوں کی فراوانی اور نشتریت سب کچھ شامل ہے۔ اقبال کی ساری شاعری پیامیہ اور خطیبانہ رنگ لیے ہوئے ہے اس طرح انہوں نے زمانے کی نزاکت دیکھتے ہوئے اپنی غزلوں میں عشق وعاشقی کا راگ الاپنے کے بجائے مقصدیت اور حرکت وعمل کو فوقیت دی۔ بال جبریل میں ان کی ایک مشہور غزل ''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں''ہے۔ اس غزل کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ایک مصلح قوم کی طرح اقبال اپنے مخاطب کو غفلت اور مایوسی سے جگاتے ہوئے اسے تسخیر کائنات کے لیے تیار کرتے ہیں۔ غزل کا مطلع ضرب المثل کا درجہ رکھتا ہے جس میں اقبال کہتے ہیں:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

غزل کے اس مطلع سے ذریعے اقبال اپنے

ہم وطنوں اور نوجوانوں کو کہہ رہے ہیں کہ انسان زمین پر ہے اور چاند تاروں کی تسخیر کر رہا ہے لیکن اس جہاں اور کہکشاں کی طرح قدرت نے اس کائنات میں بے شمار کہکشاں رکھے ہیں جن کی تسخیر کے لیے انسان کو تیار رہنا چاہئے۔ انسان عشق کا محور ہے اور خدا نے اسے زندگی کی قید میں ڈال کر عشق کے مختلف امتحانوں سے گزرنے کے لیے اس زمین پر بھیجا ہے۔ انسان اگر کچھ پانے کی لگن کے ساتھ کسی کام میں لگ جائے تو کامیابی ضرور اس کے قدم چومتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب کہ یونان ومصر اور اہل مشرق سے بڑے بڑے فلسفی دنیا میں ظاہر ہو رہے تھے جنہوں نے اپنی فکر سے انسانیت کو بہت فائدہ پہونچایا تھا۔ لیکن مغرب کے صنعتی وتعلیمی انقلاب کے بعد اہل مشرق کہیں پیچھے رہ گئے اور آج مغرب نے حرکت وعمل کے فلسفے پر عمل کرتے ہوئے جو ترقی کی ہے اہل مشرق ان سے مستفید تو ہو رہے ہیں لیکن وہ جس قائدانہ صلاحیت کے لیے جانے جاتے تھے وہ ان میں مفقود ہوگئی جس سے فکر مند اقبال نوجوانوں سے کہتے ہیں کہ انہیں جو کچھ ملا اس پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے بلکہ ستاروں پر کمند ڈالتے ہوئے نئے جہانوں کی تسخیر کرنا چاہئے جس کے لیے انہیں ہمت و حوصلے اور جہد مسلسل کے کئی امتحانوں سے گزرنا ہوگا۔ سونا جس طرح آگ میں تپ کر کندن ہوتا ہے اسی طرح انسان بھی عشق کے امتحانوں کو سر کرتے ہوئے کامیاب ہوتا ہے۔ اقبال ناصحانہ اور خطیبانہ انداز سے بھری اس غزل میں آگے کہتے ہیں:

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سیکڑوں کارواں اور بھی ہیں

اقبال مایوسی کا شکار اپنی قوم کو حوصلہ اور امید دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ غلامی کے بعد آزادی، ظلمت کے بعد روشنی اور ناکامی کے بعد کامیابی یقینی ہے۔ ہماری زندگی میں مایوسیاں اور مشکلات ہیں تو کوئی فکر کی بات نہیں۔ یہاں زندگی کی رمق والے مزید کئی کاروان ہیں۔ انسان کبھی حالات کا شکار زندگی سے مایوس ہوجاتا ہے اسے اپنے چاروں طرف اندھیرا اور نامساعد حالات نظر آتے ہیں۔ ایسے میں اسے کوئی حوصلہ دلانے والا ملا تو اس کی درست رہبری ہوگی اور وہ مسائل سے نکل کے کامیابی کی راہ پر گامزن ہوگا۔ اقبال اپنے تاریک دور کی پیداوار تھے لیکن انہوں نے اپنے عہد کی تاریکی سے روشنی حاصل کی تھی۔ اور نہ صرف اپنے عہد کے ہندوستان بلکہ رہتی دنیا تک انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے اپنے شعری سرمایے سے اصلاح کا کام لیا۔ اس لیے اقبال کہتے ہیں کہ جب زندگی کی ایک رمق بند ہوجائے تو ہمیں دوسری راہ پر چلنا چاہئے۔ ہجرت میں نصرت ہوتی ہے، حرکت میں برکت ہوتی ہے اور آگے بڑھنے سے منزل ملتی ہے، یہی اقبال کا پیغام ہے۔ اس غزل کے اگلے شعر میں اقبال کہتے ہیں:

قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

اقبال ایک مرتبہ پھر اپنی قوم کے لوگوں سے مخاطب ہیں کہ انہیں جو کچھ ملا ہے اس پر قناعت نہیں کرنا

چاہئے بلکہ اپنے سے پہلے کے انسانوں نے جستجو کے ذریعے جس طرح کائنات کے سربستہ راز افشا کئے اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے کام کیے۔ موجودہ دور کے نوجوانوں کو بھی چاہئے کہ وہ جو ملا اس پر قناعت کرنے کے بجائے اس کائنات کے سفر کو آگے بڑھانے کے لیے تلاش وجستجو کرتے رہیں اور آنے والی نسلوں کے لیے کچھ بھلائی کے کام کر جائیں۔ ہر زمانے میں انسانیت کو مسائل درپیش رہتے ہیں اور کچھ ایسے مسئلے ہوتے ہیں جن کا کچھ حل نہیں ہوتا لیکن خدا ان لوگوں سے نئی ایجادات کرواتا ہے جو کچھ پانے کی جستجو رکھتے ہیں۔ یہ کام مغرب بہت تیزی سے کر رہا ہے لیکن اہل مشرق کو بھی نئے آشیانوں کی تعمیر کی فکر کرنی چاہئے۔ غزل کے اگلے شعر میں ایک مرتبہ پھر اقبال قوم کو نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں

ایک نشیمن یا ایک ملک کے کھو جانے کا غم ہی حتمی نہیں ہے بلکہ انسانیت سراپا مسائل سے دوچار ہے۔ اور اس کی ناکامیوں پر آہ وزاری کرنے کے مزید کئی مواقع ہیں۔ صحت، تعلیم، معیشت اور دیگر شعبوں میں انسان کی ناکامیاں اسے رونے پر مجبور کر دیں گی۔ لیکن انسان کو ناکامی اور غلامی سے مایوس نہیں ہونا چاہئے بلکہ عزم مصمم اور اتحاد ملتے کے ساتھ اپنے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ اقبال غزل کے اگلے شعر میں اپنے شاہینوں سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اقبال نے نوجوانوں کو اکثر مقامات پر شاہینوں سے تشبیہ دی ہے۔ اقبال نے شاہین پرندے کو اس لیے منتخب کیا کہ اس کی پرواز اونچی ہوتی ہے۔ وہ مردہ نہیں کھاتا اور جوش اور ولولے کے ساتھ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اقبال ملک وقوم کے نوجوانوں کو ہمیشہ شاہین صفت دیکھنا چاہتے ہیں جو نامساعد حالات میں عزم و استقلال کے ساتھ آگے بڑھتا ہی رہتا ہے۔ اقبال ایک دوراندیش فلسفی کی طرح نوجوانوں سے کہہ رہے ہیں کہ ان کے سامنے ترقی کی کئی راہیں ہیں جن پر چلتے ہوئے وہ ملک وقوم کا نام روشن کر سکتے ہیں۔ انسان کو دن میں خواب دیکھنے کا ہنر بھی سیکھنا چاہئے انسان نے پرندے کو اڑتے دیکھ کر خود ہوا میں اڑنے کا خواب دیکھا تھا جو بعد میں جہاز کی شکل میں شرمندہ تعبیر ہوا۔ اسی طرح فکر وسوچ کی پرواز کی کوئی حد نہیں۔ انسان پہلے خواب دیکھ کر کچھ ہدف منتخب کرے پھر اسے حاصل کرنے کی جہد مسلسل کرے تو حیرت انگیز کامیابیاں اسے حاصل ہو سکتی ہیں۔ اقبال مزید کہتے ہیں:

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

عام انسان اور خاص انسان میں بہت فرق ہوتا ہے۔ عام انسان روٹی کپڑے اور مکان کے چکر میں زندگی کے چکر کھاتا رہتا ہے لیکن انسان کو ان ضروریات زندگی کے چکر میں الجھ کر نہیں رہ جانا چاہئے۔ کیوں کہ اللہ نے

اسے اشرف المخلوقات بنایا ہے اور اسے نیابت اور خلافت خداوندی کے منصوبے کو عمل میں لانا ہے۔ اللہ نے کہہ دیا ہے کہ اس کا رزق تو اسے مل کر رہے گا بس اسے کچھ جستجو کرنا ہے لیکن اسی رزق کے لیے وہ زندگی کے ہر جائز و ناجائز کو اختیار نہ کر لے۔ انسان کی اس دنیا میں جو مختصر حیات ہے وہ ضروریات زندگی کی تکمیل میں لگ جانے کے لیے نہیں بلکہ اپنی اخروی زندگی کو کامیاب بنانے اور اس زندگی میں دنیا کو کچھ دینے کے لیے ہے اس لیے اقبال انسانوں سے کہتے ہیں کہ زندگی کی راہ میں الجھ نہ جائیں بلکہ کچھ اہم کارنامے انجام دیں۔ اقبال اس غزل کے آخر میں کہتے ہیں:

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

اقبال غم میں ڈوبے لوگوں کو حوصلہ دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ مشکلات و پریشانیاں کسی ایک کو نہیں بلکہ اس میں سبھی انسان شامل ہیں۔ جب انسان ایک دوسرے کے غم آپس میں بانٹ لیتے ہیں، اپنے دل کی کیفیت سنا لیتے ہیں تو ان کا غم ہلکا ہو جاتا ہے۔ ہندوستان کی غلامی کا غم ایک قومی غم تھا۔ اسی طرح زندگی کے عملی میدان میں پچھڑنے کا غم بھی کئی لوگوں کا تھا۔ ایسے غمزدہ ماحول میں اقبال ایک دوسرے کو تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ غموں سے نکلنا اور اپنے لیے سکھ چین حاصل کرنا ہی بڑی بات ہے۔

اقبال کی اس شاہکار غزل کے مفاہیم کے مطالعے سے انداز ہوتا ہے کہ ایک مصلح قوم اور خطیب ملت کی طرح اقبال غلامی میں ڈوبی ہندوستانی قوم اور عمومی طور پر مصائب و آلام کا شکار لوگوں کو حوصلہ دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ مایوسی ترک کریں اور آگے بڑھ کر نئے جہانوں کی کھوج کریں۔ اقبال کی پیامیہ شاعری کی ہر زمانے میں عصری معنویت رہی ہے موجودہ دور میں بھی ہندوستان اور عالم اسلام کے حالات ظلمت کے اندھیروں میں ڈوبے ہوئے ہیں اگر اقبال کے اس پیغام کو عام کیا جائے تو اندھیرے میں ایک مرتبہ پھر امید کی کرن جاگ سکتی ہے۔

☆☆☆

علامہ اقبالؒ کی ایک خوبصورت غزل

جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

نومید نہ ہو اُن سے اے رہبرِ فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

اے طائرِ لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسداللّٰہی

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

oOo

ڈاکٹر محمد انورالدین

اسسٹنٹ پروفیسر اُردو
کالج آف لینگویجس حیدرآباد (تلنگانہ)

شاعر مشرق کی حیات ،سنین کے آئینے

شیخ محمد اقبال نام ،اقبالؔ تخلص رکھتے تھے ۔انگریزی حکومت نے سر کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ان کا تعلق کشمیری برہمن خاندان سے تھا جن میں بابا صالح نامی شخص سترھویں صدی عیسویں میں مشرف با اسلام ہوئے ۔ یہ علامہ اقبال کے جد اعلیٰ ہوتے ہیں،جن کی اولاد نے غدر کے ہنگاموں کے بعد سیال کوٹ پنجاب کو اپنا مسکن بنایا تھا۔ اس طرح پہلے پہل اقبال کے دادا شیخ رفیق یہاں جاں گزیں ہوئے، انھیں دو صاحب زادے شیخ نور محمد اور شیخ غلام قادر تھے ۔ شیخ نور محمد کی اولاد میں شیخ محمد اقبال بہت مشہور ہوئے۔

اس مضمون میں اقبال کی حیات مبارک کے اہم گوشوں اور ادبی حیثیت کے حامل نکات کو سنین کے لحاظ سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے،تاکہ تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈیمی کے علمی، ادبی،لسانی ،فنی اور سائنسی جریدے ماہ نامہ قومی زبان حیدرآباد کے گوشۂ علامہ اقبال کے لیے سود مند ہو۔راقم الحروف کو خیال ہوا کہ اقبال کی زندگی کے ان اہم گوشوں کو وا کرتا چلوں جن کے مطالعے سے شاعر مشرق کی حیات کے اہم گوشے سنین کے آئینے میں ہمارے سامنے آجائیں۔

گو یہ کام نیا اور تخلیقی نہیں ہے،لیکن معلوماتی ضرور ہے۔قارئین قومی زبان کے تفنن طبع کے لیے پیش خدمت ہے۔

۱۸۷۷ء میں ۹رنومبر کو سیالکوٹ پنجاب میں پیدا ہوئے۔

۱۸۸۲ء میر حسن کے مکتب میں اردو،عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔

۱۸۸۳ء اسکاچ مشن اسکول، سیالکوٹ میں داخلہ لیا۔

۱۸۸۸ء پرائمری امتحان کامیاب کیا۔

۱۸۹۱ء میں اسکاچ مشن آئی اسکول سیالکوٹ سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔

۱۸۹۲ء میں شعر گوئی کا آغاز کیا۔

۱۸۹۳ء میں اسکاچ مشن اسکول سیالکوٹ سے درجہ اول میں میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔

❖ ۴رمئی کو اسکاچ مشن کالج (مرے کالج) میں داخلہ لیا۔

❖ استاد داغ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔

❖ کریم بی بی سے شادی ہوئی۔

❖ ماہ نامہ ''زبان'' دہلی کے نومبر کے شمارے میں پہلی غزل شائع ہوئی۔

۱۸۹۴ء سے ادبی رسالوں میں کلام کی اشاعت کا سلسلہ چل پڑا۔

۱۸۹۵ء میں اسکاچ مشن کالج سے انٹر میڈیٹ کے امتحان میں درجے دوم سے کامیابی حاصل کی۔

❖ گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔اے میں داخلہ لیا۔

۱۸۹۶ء میں فروری سے مشاعروں میں شرکت کا آغاز ہوااور ۲۵ اشعار پر مشتمل نظم بعنوان ''فلاح قوم'' سنائی۔

۱۸۹۷ء میں بی۔اے کا امتحان درجے دوم سے پاس کیا۔

❖ ایم۔اے (فلسفہ) میں داخلہ لیا۔

۱۸۹۸ء میں ۱۱رفروری کو طامس آرنلڈ علی گڑھ سے لاہور تشریف لائے جہاں اقبال کو ان سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔

❖ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔اے کا امتحان دوسرے درجے سے کامیاب ہوئے۔

❖ قانون کے ابتدائی امتحان میں حصول قانون کے پرچے میں ناکام ہوئے۔

۱۸۹۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔اے (فلسفہ) میں تیسرے درجے سے کامیاب ہوئے۔

❖ یونیورسٹی میں فلسفہ کے واحد کامیاب طالب علم ہونے کی وجہ سے انعام سے نوازے گئے۔

❖ میں آفتاب اقبال پیدا ہوئے۔

❖ اپریل میں اقبال کے استاذ آرنلڈ اورینٹل کے پرنسپال کے عہدے پر فائز ہوئے۔

❖ ۱۳رمئی کو اورینٹل کالج کے میکلوڈ عربک شعبے میں ریڈر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔

❖ نومبر میں انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے رکن بنائے گئے۔

۱۹۰۰ء میں ۲۴رفروری کے انجمن حمایتِ اسلام کے پندرھویں سالانہ جلسے میں پہلی بار نظم ''نالۂ یتیم'' سنائی۔

۱۹۰۱ء میں یکم جنوری کو اورینٹل کالج کی ملازمت کے دوران بلا تنخواہ چھے ماہ کی رخصت لے کر اسلامیہ کالج لاہور میں انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا۔

❖ ۴رجنوری کو لالہ جیارام کی جگہ گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے تقرر عمل میں آیا۔

❖ دوسری لڑکی پیدا ہوئی اور فوت ہوگئی۔

❖ ۲۴رفروری کو انجمن حمایت اسلام کے ۱۶ویں سالانہ جلسے میں اپنی دوسری مشہور نظم ''دردِ دل المعروف بہ یتیم کا خطاب ہلال عید سے'' پڑھی۔

❖ اپریل کو مخزن لاہور کے پہلے شمارے میں ''کوہستان ہمالہ'' کے عنوان سے ایک نظم شائع ہوئی۔

❖ انجمن کشمیری مسلمان کی دوبارہ تشکیل ہونے پر سکریٹری بنائے گئے۔

❖ ۲۳رفروری کو انجمن حمایت اسلام کے سترھویں سالانہ جلسے میں صدر جلسہ نظام الدین (سب جج راولپنڈی) نے اقبال کو ''ملک الشعرا'' کا خطاب عطا کیا۔

❖ ستمبر میں ''زبان اردو'' کے عنوان سے ایک مضمون

مجلّہ مخزن میں شائع ہوا۔
❖ اکتوبر کو ایک نظم ''خیر مقدم'' کے نام سے انجمن حمایت اسلام کے سترھویں سالانہ اجلاس میں پڑھی۔
❖ ۱۶/اکتوبر کو دوسو روپیہ ماہ وار پر گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔
(جہاں اقبال ۳۱/مارچ ۱۹۰۳ء تک برسر کار رہے۔)

۱۹۰۲ء میں ۱۳/اکتوبر کو گورنمنٹ کالج لاہور میں چھے ماہ کے لیے انگریزی کے استاد مقرر ہوئے۔

۱۹۰۳ء میں ۳/جون کو گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے تقرر عمل میں آیا۔
❖ ۳۰/دسمبر کو گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر کی مدت دوبارہ ختم ہونے کی صورت میں مزید چھے ماہ کی توسیع کی گئی۔

۱۹۰۴ء میں ۲۶/فروری کو طامس آرنلڈ استاذِ اقبال گورنمنٹ کالج لاہور کی ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔
❖ اقبال نے اپنے استاذ کے فراق میں ''نالۂ فراق'' کے عنوان سے ۲۴ اشعار پر مشتمل ایک نظم کہی۔
❖ ۳۱/مارچ میں اقبال کی مدت ملازمت میں مزید توسیع کی گئی اور تنخواہ دوسو روپے سے دوسو پچاس روپے ماہ وار کر دی گئی۔
❖ رسالہ ''مخزن'' کے مئی کے شمارے میں نظم ''نالۂ فراق'' شائع ہوئی۔
❖ ''تصویر درد'' کے عنوان سے ایک نظم انجمن حمایت اسلام کے انیسویں سالانہ جلسے میں پڑھی۔
❖ اگست میں اپنے بڑے بھائی عطا محمد کے پاس چند دنوں کے لیے ایبٹ آباد گئے۔
❖ اسی قیام کے دوران ''قومی زندگی'' کے موضوع پر زبردست لکچر دیا۔
❖ مقالہ ''قومی زندگی'' رسالۂ مخزن کے اکتوبر کے شمارے میں شائع ہوا۔

۱۹۰۵ء جنوری میں شیخ عبد القادر نے رسالۂ مخزن میں اقبال کا ایک مضمون بعنوان ''سپاس امیر'' شائع کیا۔
❖ ۱۷/فروری کو اقبال کے استاد حضرت داغ دہلوی داغ مفارقت دے گیے۔
❖ اقبال نے اپنے استاذ داغ دہلوی کی رحلت پر ۱۷ اشعار پر مشتمل ایک زبردست مرثیہ تخلیق کیا۔
❖ یکم ستمبر میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے لاہور سے یورپ روانہ ہوئے۔
❖ ۲/ستمبر کو دہلی پہنچے اور حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ پر حاضری دی اور ۳۶ اشعار پر مشتمل ایک نظم ''التجائے مسافر'' رقم کی۔
❖ اکتوبر میں شاہ سلیمان پھلواری کی مدد سے خواجہ حسن نظامی کے نام کیمبرج یونیورسٹی سے ایک خط

میں تصوف اور وحدت الوجود پر قرآن و حدیث سے حوالے دریافت کیے۔

❖ ۶ رنومبر کو ''لنکز ان'' میں بیرسٹری کے لیے داخلہ لیا۔

۱۹۰۶ء میں ۷ رمارچ کو بی۔اے کے حصول کے لیے فلسفۂ اخلاقیات کے شعبے میں ایک مقالہ داخل کیا۔

❖ اپریل میں ہندوستان میں سودیشی تحریک سے متعلق چند سوالات اور ان کے جوابات کی شکل میں ایک مضمون رسالہ ''زمانہ'' کانپور میں شائع ہوا۔

❖ اگست اور ستمبر کے مہینوں میں شیخ عبدالقادر اور مشیر حسین قدوائی کے ہم راہ استنبول کے دارالخلافہ گئے۔

۱۹۰۷ء میں یکم اپریل کو لندن میں پہلی مرتبہ عطیہ فیضی سے ایک تقریب میں ملاقات ہوئی۔

❖ ۱۳ رجون کو کیمبرج یونیورسٹی نے بی۔اے کی ڈگری عطا کی۔

❖ ۶ رنومبر کو میونخ یونیورسٹی (جرمنی) میں پی ایچ۔ڈی کی ڈگری کے لیے اپنا انگریزی مقالہ ''ایران میں مابعدالطبیعات کا ارتقا'' کے موضوع پر لکھا۔

۱۹۰۸ء میں ۲۲ رجنوری کو ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن کے نام بذریعہ خط گورنمنٹ کالج لاہور کی ملازمت سے استعفیٰ پیش کر دیا۔

❖ سر طامس آرنلڈ چھ ماہ کی رخصت پر مصر گئے تو اقبال کو اپنی جگہ عربی میں لکچر دینے کے لیے مقرر کر گئے۔

❖ بی۔اے اور پی ایچ۔ڈی کا مقالہ ''انگریزی میں ڈولپمنٹ آف میٹا فزکس اِن پرشیا'' کے عنوان سے شائع ہوا۔

❖ یکم جولائی کو لنکز ان سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی۔

❖ ۲۶ رجولائی کو لندن سے دہلی پہنچے اور محبوب الٰہی کے مزار پر حاضری دی۔

❖ اکتوبر میں بہ حیثیت ایڈوکیٹ انرولمنٹ ہوئی۔

۱۹۰۹ء میں ۲۲ رجنوری کو انجمن کشمیری مسلمان لاہور کا قیام عمل میں آیا۔

❖ ۶ رفروری کو انجمن کشمیری مسلمان لاہور کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔

❖ ۲۴ رفروری کو انجمن حمایت اسلام کی مجلس انتظامیہ کی تین سالہ میعاد کے لیے رکن منتخب ہوئے۔

❖ یکم مئی کو گورنمنٹ کالج لاہور کے فلسفہ کے پروفیسر منتخب ہوئے۔

(جہاں ۳۱ ردسمبر ۱۹۳۰ء تک وکالت کے علاوہ فلسفہ پڑھاتے رہے۔)

❖ ۱۰ رمئی کو لا پبلشنگ ہاؤس لاہور کے ایک جریدے انڈین کیسز لاء رپورٹس کے حلقہ ادارت میں شریک مدیر کی حیثیت سے ذمے داری قبول کی۔

۱۹۱۰ء میں ۲ رفروری کو انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔

❖ سردار بیگم سے نکاح ہوا، لیکن رخصتی نہیں ہوئی۔
❖ ۲؍ مارچ کو پنجاب یونیورسٹی کا فیلو نامزد کیا گیا۔
❖ ۱۸؍ مارچ کو کالج سے رخصت لے کر حیدرآباد دکن کے لیے روانہ ہوئے اور سر اکبر حیدری کے یہاں قیام کیا۔
❖ ۲۸؍ مارچ کو حیدرآباد دکن سے لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔
❖ ۲۶؍ جولائی کو انجمن حمایت اسلام کی کالج کمیٹی کے سکریٹری منتخب ہوئے۔
❖ ۳۱؍ جولائی کو گورنمنٹ کالج لاہور کی ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔

۱۹۱۱ء میں نظم ''شکوہ'' انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں پڑھی۔
❖ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ دہلی کے تیسرے اجلاس کی صدارت کی۔
❖ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں (The Muslim Community) المعروف بہ ''ملت بیضہ پر ایک عمرانی نظر'' کے موضوع پر انگریزی میں لکچر دیا۔
❖ ۱۵؍ اپریل کو پنجاب پراونشل ایجوکیشنل لاہور کی داغ بیل پڑی اور ڈاکٹر اقبال اس کی ایگزیکیٹو کمیٹی کے سکریٹری منتخب ہوئے۔

۱۹۱۲ء میں یکم فروری کو باغ بیرون موچی دروازہ میں مسلمانوں کے ایک جلسۂ عام سے خطاب کیا۔
❖ ۱۶؍ اپریل کو نظم ''شمع و شاعر'' انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں سنائی۔
❖ ۳۰؍ نومبر کو جلسۂ عام منعقدہ بیرون موچی دروازہ میں نظم ''جواب شکوہ'' سنائی۔

۱۹۱۳ء میں مختار بیگم سے نکاح ہوا اور اسی سال سردار بیگم سے تجدید نکاح کیا، کیوں کہ ۱۹۰۱ء میں شادی کے بعد رخصتی نہیں ہوئی تھی۔
❖ ۷؍ ستمبر کو ایک مقدمے کے سلسلے میں کانپور پہنچے۔
❖ ۹؍ ستمبر کو الہ آباد میں اکبرالہ آبادی سے ملاقات ہوئی۔
❖ ۱۰؍ ستمبر کو دہلی میں حکیم اجمل خاں سے ملاقات کی۔

۱۹۱۴ء میں مہاراجہ کشن پرشاد کے نام خط میں یوں لکھتے ہیں:
''فارسی مثنوی کے اشعار ساتھ ساتھ ہو رہے ہیں، میں اس مثنوی کو زندگی کا مقصد سمجھتا ہوں، میں مرجاؤں گا یہ زندہ رہنے والی چیز ہے۔''
❖ ستمبر میں فارسی شاعری کا مجموعہ اسرار خودی شائع ہوا۔
❖ ۹؍ نومبر کو والدۂ محترمہ امام بی بی نے سیالکوٹ میں آخری سانسیں لیں۔
❖ ۱۷؍ نومبر کو پہلی بیٹی معراج بانو کا انتقال ہوا۔

۱۹۱۶ء میں ۳۰؍ جنوری کو انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔

۱۹۱۷ء میں رسالہ مخزن میں ''قومی زندگی'' کے عنوان سے جولائی کے شمارے میں ایک مضمون شائع

ہوا۔

۱۹۱۸ء کے ماہ اپریل میں ''رموزِ بے خودی'' کی اشاعت عمل میں آئی۔
❖ جون میں ''اسرار خودی'' کا دوسرا ایڈیشن منظر عام پر آیا۔
❖ ۱۵ر دسمبر کو پہلی جنگ عظیم کی فتح کی خوشی میں ایک جلسہ عام ہوا تو گورنر پنجاب سر مائیکل اوڈوائر کی فرمائش پر اقبال نے چند نظمیں سنائیں۔

۱۹۱۹ء میں اورینٹل فیکلٹی کے ڈین مقرر ہوئے۔
❖ ۱۶ر دسمبر کو انجمن حمایت اسلام کے سکریٹری جنرل منتخب ہوئے۔
❖ مثنوی اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ پروفیسر آر۔ اے نکلسن نے کیا۔

۱۹۲۱ء میں ۱۳ر نومبر کو روز نامہ زمین دار (لاہور) میں گاندھی جی کی تعریف میں ڈاکٹر اقبال کے پانچ شعر شائع ہوئے۔

۱۹۲۲ء میں ۱۶ر اپریل کو انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں نظم ''خضر راہ'' سنائی۔
❖ ۳۱ر جولائی کو انجمن حمایت اسلام کی جنرل سکریٹری شپ سے مستعفی ہو گئے۔
❖ میں نپولین کے مزار پر گئے۔

۱۹۲۳ء میں یکم جنوری کو حکومت ہند کی جانب سے سر کا خطاب عطا ہوا۔
❖ ۳۰ر مارچ کو ''طلوع اسلام'' انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں پڑھی۔
❖ یکم مئی کو پیام مشرق کی اشاعت عمل میں آئی۔

۱۹۲۴ء میں ''پیام مشرق'' کا دوسرا ایڈیشن مارچ کے مہینے میں شائع ہوا۔
❖ ستمبر میں اردو نظموں اور غزلوں کا پہلا مجموعہ ''بانگ درا'' منظر عام پر آیا۔
❖ ۵ر اکتوبر کو جاوید اقبال پیدا ہوئے۔
❖ ۲۱ر اکتوبر کو مختار بیگم کا لدھیانہ میں انتقال ہو گیا۔

۱۹۲۵ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں ''اسلام اور اجتہاد'' کے عنوان پر لکچر دیا۔

۱۹۲۶ء میں ''بانگ درا'' کا دوسرے ایڈیشن ستمبر کے مہینے میں شائع ہوا۔
❖ ۶ر دسمبر کو پنجاب مجلس قانون ساز کے انتخابات میں کامیاب ہوئے۔
❖ ۲۳ر نومبر کو صوبائی مجلس قانون ساز پنجاب کے رکن منتخب ہوئے۔
❖ میں محمد علی جناح اقبال سے ملنے آئے تو انھوں نے کہا تھا:
''میں آپ کے مشن کے کامیابی کے لیے اپنے لہو کا آخری قطرہ نچوڑ دوں گا۔''

۱۹۲۷ء میں ۱۰ر مارچ کو پنجاب مجلس قانون ساز کے بجٹ سیشن میں پہلی مرتبہ تعلیم کے مسئلے پر آواز اٹھائی۔
❖ ۱۶ر اپریل کو انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں ''دی اسپرٹ آف اسلامک کلچر'' کے موضوع پر انگریزی میں تقریر کی۔
❖ یکم مئی میں لاہور میں پنجاب صوبائی مسلم لیگ

کا اجلاس ہوا جس میں اقبال نے ایک قرارداد پیش کی کہ میں ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت کے احساس کے باوجود کہوں گا کہ حالات مخلوط طریق انتخاب کے لیے موزوں نہیں۔

❖ ۲۶ رمئی کو اقبال کے دوست مولانا غلام قادر گرامی کا انتقال ہوگیا۔

❖ جون میں ''زبورِعجم'' (فارسی) کی اشاعت عمل میں آئی۔

۱۹۲۸ء میں مدراس، بنگلور، میسور اور حیدرآباد دکن کے مختلف جلسوں میں انگریزی زبان میں خطبات پیش کیے۔

❖ ۱۸ راپریل کو انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں ''فلسفہ اسلام'' کے موضوع پر انگریزی میں تقریر کی۔

❖ ۱۸ رمئی کو درد گردہ کا حملہ اور علالت کی ابتدا ہوئی۔

❖ ۲۴ رجون کو آل انڈیا مسلم لیگ کے عہدۂ معتمدی سے استعفیٰ دے دیا۔

۱۹۲۹ء میں یکم جنوری کو دہلی میں آل انڈیا مسلم کانفرنس میں شریک رہے۔

❖ ۵ رجنوری کو شام میں گوکھلے ہال میں انگریزی میں اپنا پہلا خطبہ دیا۔

❖ ۶ رجنوری کو ۶ بجے شام خطبات مدراس کے سلسلے کا دوسرا خطبہ دیا۔

❖ ۷ رجنوری کو انجمن ترقی اردو مدراس کی جانب سے دعوت دی گئی۔

❖ ۸ رجنوری کی شام میں اپنا تیسرا خطبہ دیا۔

❖ ۹ رجنوری کو مدراس سے بنگلور روانہ ہوئے اور شام ۶ بجے گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج میں انگریزی میں خطبہ دیا۔

❖ ۱۰ رجنوری کو سرنگا پٹنم روانہ ہوئے اور سلطان شہید کے مزار پر حاضری دی۔

❖ ۱۲ رجنوری کو میسور یونیورسٹی کے شعبہ نفسیات عملی کی دعوت میں مدعو تھے۔

❖ ۱۳ رجنوری کو حیدرآباد پہنچے۔

❖ ۱۵ رجنوری کو خطبات مدراس میں سے ایک انگریزی لکچر دیا۔

❖ ۱۹ رجنوری کو نظام دکن سے ملاقات کی پھر لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔

❖ ۱۴ راپریل کو انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں ''قرآن کا مطالعہ'' کے موضوع پر تقریر کی۔

❖ مئی میں پنجاب ہائی کورٹ کے جج کے عہدے کے لیے اقبال کا نام تجویز تو لیا گیا، لیکن تقرر نہ ہوسکا۔

❖ جولائی میں پیام مشرق کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا۔

❖ ۲۵ رستمبر کو مولوی میر حسن کا سیال کوٹ میں انتقال ہوگیا۔

❖ ۱۷ رنومبر کو لاہور سے علی گڑھ کے لیے روانہ ہوئے۔

❖ ۱۸ رنومبر کو علی گڑھ کے اکابرین سے ملاقات

ہوئی۔
❖ ۱۹؍نومبر کو علی گڑھ کے اسٹریچی ہال میں خطبہ دیا۔
❖ ۲۳؍نومبر کو علی گڑھ انٹرمیڈیٹ کالج یونین کے اعزازی لائف ممبر مقرر ہوئے۔
❖ یونیورسٹی کی طرف سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی گئی۔

۱۹۳۰ء میں منیرہ بانو پیدا ہوئیں۔
❖ مارچ میں ''بانگ درا'' کے تیسرے ایڈیشن کی اشاعت عمل میں آئی۔
❖ مئی میں خطبات مدراس (انگریزی) کی اشاعت عمل میں آئی۔
❖ ۱۰؍جون کو سر طامس آرنلڈ اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔
❖ ۱۷؍اگست کو والد محترم شیخ نور محمد کا انتقال ہو گیا۔
❖ ۲۹؍نومبر کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ جلسہ الٰہ آباد کی صدارت کی۔
❖ ۲۹؍دسمبر کو الٰہ آباد میں کل ہند مجلس لیگ کے سالانہ جلسے میں علاحدہ مسلم مملکت کا تصور پیش کیا۔

۱۹۳۱ء میں اپریل کے مہینے میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقدہ دہلی میں شرکت کی۔
❖ ۸؍ستمبر کو دوسری گول میز کانفرنس کے لیے دہلی روانہ ہوئے۔
❖ ۱۰؍ستمبر کو شام عطیہ بیگم فیضی کے مکان ''ایوان رفعت'' میں دعوت میں شرکت کی۔
❖ ۲۱؍نومبر کو دوسری گول میز کانفرنس کے دوران لندن سے اٹلی کے لیے روانہ ہوئے۔
❖ ۲۲؍نومبر کو اٹلی سے روم پہنچے۔
❖ ۲۵؍نومبر کو شاہ امان اللہ خان سے روم میں ملاقات کی۔
❖ ۲۶؍نومبر کو رائل اکاڈمی میں لکچر دیا۔
❖ ۲۷؍نومبر کو مصر کے لیے روانہ ہوئے، جہاں مسولنی سے ملاقات ہوئی۔
❖ ۲۸؍نومبر کو روم میں اٹلی کے حکمران مسولینی سے ملاقات کی۔
❖ یکم دسمبر کو مصر سے اسکندریہ کے لیے روانہ ہوئے۔
❖ اسکندریہ سے قاہرہ کے لیے روانہ ہوئے۔
❖ اسلامی کانفرنس میں شرکت کے لیے فلسطین پہنچے۔
❖ ۶؍دسمبر کو بیت المقدس تشریف لے گئے۔
❖ ۷؍دسمبر کو بیت المقدس میں منعقدہ موتمر عالمِ اسلامی میں شرکت کی۔
❖ ۱۵؍دسمبر کو فلسطین سے روانگی کا عزم کیا، لیکن جہاز تاخیر سے پہنچنے کی وجہ سے دو یوم پورٹ سعید میں ٹھہرے رہے۔
❖ ۲۸؍دسمبر کو ممبئی میں آمد ہوئی اور خلافت ہاوس میں قیام کیا۔
❖ ۲۹؍دسمبر کو دہلی پہنچے۔

❖ ۳۰؍دسمبر کو لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔

۱۹۳۲ء میں فروری کے مہینے میں ''جاوید نامہ'' کی اشاعت عمل میں آئی۔

❖ ۶؍مارچ کو اسلامی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے پہلا یوم اقبال منایا گیا۔

❖ ۳۱؍مارچ کو آل انڈیا مسلم کانفرنس لاہور کے اجلاس کی صدارت کی۔

❖ ۲۰؍جون کو آل انڈیا کشمیر کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا۔

❖ ۱۷؍اکتوبر کو تیسری گول میز کانفرنس کے لیے روانہ ہوئے۔

❖ ۱۹؍اکتوبر کو ممبئی پہنچے اور دو روز قیام کیا۔

❖ ۲۲؍اکتوبر کو ممبئی سے یورپ کے لیے روانہ ہوئے۔

❖ ۱۲؍نومبر کو لندن میں استقبال کیا گیا۔

❖ ۱۷؍نومبر کو گول میز کانفرنس کا پہلا اجلاس ہوا۔

❖ ۲۰؍دسمبر کو لندن سے پیرس کے لیے روانہ ہوئے۔

❖ ۲۱؍دسمبر کو فرانسیسی فلسفی ہنری برگساں سے ملاقات کی۔

❖ میں بابر کی مزار پر حاضری دی۔

❖ میں مسجد قرطبہ کی زیارت کے لیے اسپین گئے۔

۱۹۳۳ء میں جنوری کے اوائل میں اسپین پہنچے جہاں قرطبہ،غرناطہ،اشبیلیہ،میڈرڈ اور دوسرے شہروں میں تاریخی آثار کا مشاہدہ کیا۔

❖ ۱۲؍جنوری کو جنوبی ہسپانیہ سے میڈرڈ واپس ہوئے۔

❖ ۲۴؍جنوری کو میڈرڈ یونیورسٹی میں لکچر دیا۔

❖ ۲۶؍جنوری کو پیرس پہنچے اور جنوری کے آخر تک قیام کیا۔

❖ ۱۰؍فروری کو وینس سے ہندوستان کے لیے روانہ ہوئے۔

❖ ۲۲؍فروری کی صبح کو بمبئی پہنچے۔

❖ ۲۷؍فروری کو بمبئی سے لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔

❖ یکم مارچ کو اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے استقبالیہ دیا۔

❖ ۱۸؍مارچ کو جامعہ ملیہ میں توسیعی خطبات کی صدارت کی۔

❖ یکم اکتوبر کو حکیم سنائی کے مزار پر نظم ''افکار پریشاں'' تخلیق ہوئی۔

❖ ۲۰؍اکتوبر کو افغانستان کے لیے روانہ ہوئے۔

❖ ۲۴؍اکتوبر کو باغ بابر میں گارڈن پارٹی میں شرکت کی۔

❖ ۲۶؍اکتوبر کو نادر شاہ سے ملاقات کی۔

❖ ۲۸؍اکتوبر کو انجمن ادبی کابل کی جانب سے استقبالیہ دیا گیا۔

❖ یکم نومبر کو کابل سے قندھار پہنچے۔

❖ ۲؍نومبر کو چمن کے لیے روانگی عمل میں آئی۔

❖ ۳رنومبر کو کوئٹہ سے لاہور روانہ ہوئے۔
❖ ۴رنومبر کو لاہور پہنچے۔
❖ ۴ر دسمبر کو پنجاب یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔
❖ میں مثنوی ''مسافر'' شائع ہوئی۔

۱۹۳۴ء میں ۱۰رجنوری کے دن عیدالفطر کے موقع پر سویوں میں دہی ملا کر کھایا، جس کے سبب گلا بیٹھ گیا۔ یہیں سے طویل علالت کا آغاز ہوا۔
❖ مئی میں ''خطبات مدراس'' انگریزی کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت عمل میں آئی۔
❖ ۲۹رجون کو حضرت مجدد کے مزار پر حاضری دی۔
❖ یکم جولائی کو انجمن حمایت اسلام کے صدر منتخب ہوئے۔
❖ ۱۷رنومبر کو لاہور سے علی گڑھ کے لیے روانہ ہوئے۔
❖ ۱۸رنومبر کو صبح علی گڑھ پہنچے۔
❖ ۲۰رنومبر کو اسٹریچی ہال علی گڑھ میں خطبہ دیا۔
❖ ۲۵رنومبر کو علی گڑھ سے لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔
❖ نومبر کو مثنوی مسافر (سیاست افغانستان) کی اشاعت عمل میں آئی۔
❖ ۱۳ردسمبر کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

۱۹۳۵ء میں جنوری کے مہینے میں ''بال جبریل'' شائع ہوئی۔
❖ ۳۰رجنوری کو جامعہ ملیہ دہلی میں ترک خاتون خالدہ ادیب خانم کے لکچر کی صدارت کی۔
❖ ۳۱رجنوری کو بغرض علاج بھوپال کا سفر کیا۔
❖ ۵رفروری کو بھوپال کے حمیدیہ ہاسپٹل میں برق شعاعوں کے ذریعے علاج کی ابتدا ہوئی۔
❖ ۷رمارچ کو بھوپال سے دہلی کے لیے روانہ ہوئے۔
❖ ۸رمارچ کو دہلی پہنچے اور حکیم نابینا کو اپنی نبض دکھائی۔
❖ ۹رمارچ کو لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔
❖ ۱۰رمارچ کو لاہور پہنچے۔
❖ اپریل میں جاوید منزل کی تعمیر مکمل ہوئی۔
❖ مئی میں اہلیہ سردار بیگم کا لاہور میں انتقال ہوگیا۔
❖ یکم جون کو نواب حمید اللہ خاں والئی بھوپال نے پانچ سو روپیہ ماہانہ وظیفہ جاری کیا۔
❖ ۱۵رجولائی کو برقی علاج کے لیے بھوپال کا دوسرا سفر کیا۔
❖ ۲۸راگست کو برقی علاج کے سلسلے میں بھوپال گئے اور وہاں سے دہلی کے لیے روانہ ہوئے۔
❖ ۳۰راگست کو دہلی سے لاہور پہنچے۔
❖ ۲۵راکتوبر کو جشن صد سالہ حالی میں شرکت کے لیے پانی پت کا سفر کیا۔

۱۹۳۶ء میں پنجاب مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔
❖ ۱۲راپریل کو انجمن حمایت اسلام کے سالانہ

جلسے میں نظم ''نغمۂ سرمدی'' سنائی اور یہ آخری شرکت ثابت ہوئی۔

❖ مئی میں مثنوی مسافر'' کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت عمل میں آئی۔

❖ جولائی میں شعری مجموعہ ''ضرب کلیم'' شائع ہوا۔

❖ ۲۹؍جولائی کوڈھا کہ یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

❖ اکتوبر میں مثنوی ''پس چہ باید کردا ے اقوام مشرق'' کی اشاعت عمل میں آئی۔

❖ دسمبر میں مثنوی ''پس چہ باید کردا ے اقوام مشرق'' مع مسافر کی اشاعت عمل میں آئی۔

۱۹۳۷ء میں حکیم نابینا کا علاج چلتا رہا۔

❖ ۱۳؍دسمبر کوالہ آباد یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

❖ ۲۷؍جولائی کو تقسیم فلسطین سے متعلق ایک بیان شائع ہوا۔

❖ ۱۰؍دسمبر کو شعبۂ تحقیقاتِ اسلامی کے قیام کی ضرورت پر تفصیلی بیان دیا۔

۱۹۳۸ء میں یکم مارچ کوعثمانیہ نیورسٹی حیدرآباد دکن نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری سے سرفراز کیا۔

❖ ۲۱؍اپریل کوعلامہ اقبال نے صبح ۵ بج کر ۱۴ منٹ پر جاوید منزل میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

۲۰؍اپریل کی رات ہی سے اقبال کی حالت میں تغیرو تبدل شروع ہوگیا تھا۔شانوں میں سخت درد ہونے کی شکایت کرتے جارہے تھے،ڈاکٹروں کی ہدایت تھی کہ نیند کی دوائی دیں تاکہ رات ٹل جائے اور صبح سے نیا علاج شروع کیا جاسکے،لیکن اقبال نے یہ کہتے ہوئے ڈاکٹروں کی رائے کومسترد کردیا کہ میں بے ہوشی کے عالم میں مرنا نہیں چاہتا۔اس طرح رات بھرشدید تکلیف میں مبتلا رہے۔

جب فجر کی آذانیں کھونجنے لگیں تو احباب نے نماز کے لیے مسجد کا رخ کیا،سوائے ان کے قدیم خدمت گزار علی بخش کے کہ وہ اقبال کی دیکھ بال کے لیے ٹھہرے رہے۔ بقول علی بخش اقبال نے اچانک دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہاں شدید درد ہورہا ہے اورا قبال نے اللہ کہا' ان کا سرایک طرف کوڈھلک گیا۔ٹھیک صبح ۵ بج کر ۱۴ منٹ پر جاوید منزل میں انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

شام ۵ بجے جنازہ اٹھا اور دو مرتبہ نماز جنازہ ادا کی گئی۔پہلی دفعہ اسلامیہ کالج لاہور کے وسیع وعریض میدان میں نماز ادا کی گئی اور دوسری مرتبہ شاہی مسجد کے صحن میں مولانا غلام مرشد نے نماز پڑھائی۔جنازے میں فرزندانِ توحید کے علاوہ بلا لحاظ مذہب وملت تقریباً پچیس،تیس ہزار لوگوں نے شرکت کی اورآخری دیدار کیا۔اس طرح رات ۹ بج کر ۴۵ منٹ پر تدفین عمل میں آئی۔

اقبال کا مزارحضور باغ کے قریب شاہی مسجد کے جنوب مشرقی مینار کے سائے میں واقع ہے،جس کی تعمیر کا آغاز ۱۹۴۶ء میں شروع کیا گیا تھا۔جب کہ فروری ۱۹۵۰ء میں مزار کی تعمیر کا کام پائے تکمیل کو پہنچا۔

☆☆☆

ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری عمری
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو
گورنمنٹ ڈگری کالج، رائے چوٹی ضلع کڈپہ (آندھرا پردیش)

کلامِ اقبال میں تقدیر کے چند مباحث

شاعرِ مشرق، حکیم الامت علامہ اقبال ایک شاعر، فلسفی، مفکر اور دانشور بھی تھے۔ آپ کی شخصیت جامع الکمالات تھی، جس کی متنوع جہات تھیں۔ انہوں نے اپنی خوابیدہ قوم کو جگانے اور خوابِ غفلت کا شکار امت کو بیدار کرنے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔

علامہ اقبال نے مختلف موضوعات کو معرض بحث بنایا، اپنے افکار و نظریات اور فلسفہ و خیالات کے ذریعہ اپنے فکری نظام کو تشکیل دینے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں انہوں نے فکر اسلامی کے مصادر، قرآنِ حکیم اور حدیثِ شریف سے اپنے گہرے شغف اور اپنے والہانہ تعلق کی بنیاد پر اپنی فکر کی تشکیل اسلامی بنیادوں پر کی اور کلامی مسائل کو مدلل پیش کیا۔ انہوں نے خودی کے فلسفہ کو پیش کیا۔ اس کی تعبیرات و تشریحات کے علاوہ اپنے فکری نظام کی پیشکش کے لیے مخصوص علائم کا استعمال کیا۔ اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی کو انہوں نے ایک تصوارتی نظام کے بجائے عملی تناظر میں پیش کیا۔ انہوں نے اپنی مخصوص لفظیات، قرآنی تراکیب اور اسلامی تلمیحات کے ذریعے اپنے فکری نظام کو خلق کیا ہے۔

علامہ اقبال کے کلام میں اسلامی موضوعات میں سے ایک اہم موضوع اور بنیادی عقیدہ تقدیر کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں مختلف مقامات پر مسئلہ جبر و قدر اور تقدیر کے موضوع پر بہت اہمیت کے ساتھ اپنی توجہ مبذول کی ہے۔ اقبال کے ہاں تقدیر کے موضوع پر اظہار خیال کیا گیا ہے، ان کے ہاں اس لفظ سے ترکیب پانے والے اشعار لاتعداد ہیں۔

اقبال نے تقدیر کو ایک نظری مبحث اور فکری موضوع کی طرح اٹھایا ہے۔ وہ اس کے ذریعے حرکت وعمل کا پیغام دینا چاہتے ہیں کہ تقدیر کو پوشیدہ صرف اسی لیے رکھا گیا ہے تا کہ کسی کو تدبیر اختیار کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور تدبیر اختیار کرنے سے گریز نہ کیا جا سکے۔ تقدیر کا بہانہ کسی کو حرکت وعمل اور جد و جہد سے بے نیاز نہ کر سکے۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق عمل کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ قرآنِ مجید نے عمل کو اہمیت دی ہے کہ ''وَاَنْ لیس للانسانِ اِلاّ ما سعیٰ''۔ احادیثِ مبارکہ میں بھی حکمتِ عملی، فکر و تدبر اور حسنِ تدبیر اختیار کرنے کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ ایک حدیث میں وارد ہے کہ ''اِعقلھا و توکّل علیٰ اللہ''۔ اونٹ کو باندھو، پھر اللہ پر بھروسہ کرو۔

شتر بے مہار کو چھوڑ دینے کے بعد یہ خیال کرنا کہ اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت فرمائے گا اور اونٹ محفوظ و مامون رہے گا، یہ اسلامی تعلیمات اور فطرت کے بھی عین خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ نامعقول بھی ہے۔

علامہ اقبالؔ نے اپنے کلام میں بار ہا تقدیر اور تدبیر دونوں کا ذکر کیا ہے۔ محض تقدیر پر بھروسہ کر کے تدبیر اختیار نہ کرنا، علامہ اقبال کی نظر میں نہ صرف غیر اسلامی ہے بلکہ عقل وشعور کے بھی خلاف ہے۔ انہوں نے حرکت وعمل کا پیغام دیا کیوں کہ وہ اسلامی شان وشوکت اور عظمت و رفعت کی بازیافت کے لیے وہ ماضی کی شاندار روایتوں کا احیاء کرنا چاہتے ہیں، تاکہ خیر القرون کے دور کی خصوصیات کا دوبارہ اعادہ ہو سکے اور گردشِ ایام پیچھے کی طرف لوٹ سکے۔

عظیم عبقری فلسفی علامہ اقبالؔ کو بخوبی اندازہ تھا کہ جو قوم میں زوال آمادہ ہو جاتی ہے، اسے الٰہیات کی تاویلات، قیل وقال، قال اَقول، منطقی مباحثوں اور ماضی کی لن ترانیوں میں الجھ کر رہنے اور شکایات کے انبار لگانے سے فرصت نہیں ملتی۔ ایسے حالات میں فکری رویہ یہ ہو جاتا ہے کہ کسی کو موردِ الزام ٹھہرایا جائے اور احساس ذمہ داری سے راہ فرار اختیار کیا جائے۔ ایسے حالات میں افراد کا بھی یہی رویہ رہتا ہے کہ اپنے آپ مبرا ثابت کرنے کے لیے کسی کو حالات کا باعث وموجب بتائیں اور حالات کی ذمہ داری قبول کرنے بجائے کسی کو مورد الزام ٹھہرائیں۔ ان حالات میں عالم اسلام کے حالات وکوائف پر گہری نظر رکھنے اور حالات کا گہرا شعور رکھنے کی وجہ سے علامہ اقبالؔ بخوبی واقف تھے کہ قوم میں ایسے عناصر بھی موجود ہیں جن کو اپنی تقدیر کا شکوہ ہے۔ وہ اپنے تمام اُحوال وکوائف کا ذمہ دار اپنے مقدر کو ٹھہراتے ہیں۔

عمل سے جی چرانا، کسی اقدام سے مفر اختیار کرنا اور کسی بھی قسم کی منصوبہ بندی سے گریز کرنا، ایک ایسا رویہ اور طرزِ فکر وعمل ہے، جس پر علامہ اقبالؔ نے نکیر کی ہے۔ لہٰذا انہوں نے تقدیر کے موضوع پر بڑی شد و مد کے ساتھ اظہار خیال کیا۔ ان کے خیال میں تقدیر پوشیدہ ہے، اسی لیے مقدر ہے، کیوں کہ تقدیر کے معنی ہیں پوشیدہ، مستتر اور چھپے ہوئے کے ہیں۔ تقدیر کو پوشیدہ اسی لیے رکھا گیا ہے تاکہ تدبیر اور عمل کو اختیار کیا جائے اور حرکت وعمل، کوشش وجستجو اور سعیٔ پیہم سے اپنی تقدیر خود سنواری جا سکے۔

علامہ اقبالؔ نے ملت کے قافلہ کی جس طرح حدی خوانی کی ہے، اس سے ان کے ہاں حرکت وعمل اور جد وجہد اور انقلاب کی دعوت ملتی ہے، انہوں نے اس پیغام کو جس شدت کے ساتھ اور جس شد و مد کے ساتھ پورے جوش و خروش کے ساتھ پیش کیا، اس کی مثال نہیں ملتی۔ یقیناً کلامِ اقبالؔ میں تقدیر ایک مستقل موضوع ہے اور انہوں نے اس پر بہت تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے۔

اسلامی عقائد میں ایک اہم ترین باب تقدیر کا ہے۔ ہر مسلمان کو تقدیر پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ انسان دنیا میں کیا کرے گا اور کیا نہیں کرے گا۔ یہ تمام باتیں ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہیں اور اسی کے مطابق دنیا میں اعمال وافعال کا

صدور ہوتا ہے۔ ایمانیات کا یک اہم جرو یہ ہے کہ ''ایمان بالقدر خیرہٖ وشرہٖ من اللہ تعالیٰ'' ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کا فیصلہ صادر ہو جائے کہ جن کے معاملے میں ہماری تدابیر اثر انداز نہیں ہوسکتی تو اس وقت صبر کرنا ہی تدبیر ہے۔

ذرّہ ذرّہ دہر کا زندانی تقدیر ہے
پردۂ مجبوری و بے چارگی تدبیر ہے

اور جب تقدیر کے یہ مسائل حل نہیں کئے جا سکتے لیکن ان پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ علامہ اقبالؔ فرماتے ہیں کہ منطق اور تقدیر میں کوئی توافق نہیں ہے۔ ہر نتیجہ منطق ہو، ایسا ضروری بھی نہیں:

شاید کوئی منطق ہو نہاں اس کے عمل میں
تقدیر نہیں تابعِ منطق نظر آتی

علامہ اقبالؔ کے زمانے میں بھی ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو جبر یہ رجحانات کا حامل تھا۔ اس دور میں یہ مسئلہ بہت زور وشور سے بڑی شدومد کے ساتھ بیان کیا جارہا تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہماری تقدیر لکھ دی ہے اور یہ بات بالکل صحیح ہے کہ تقدیر میں جو کچھ لکھا گیا ہے' وہ ہو کر رہنے والا ہے۔ اس لیے ہماری محنتوں اور کوششوں سے جب کوئی فائدہ نہیں تو پھر ہم کیوں نہ راضی برضا ہو جائیں۔

علامہ اقبالؔ کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے اس غلط تصور کو دور کیا کہ تقدیر کا بہانہ کر کے منصوبہ بندی اور حسنِ تدبیر سے مجبوری اور حرکت وعمل سے دوری اختیار کرنا خلافِ شرع اور خلافِ فطرت ہے۔ انہوں نے قوم کو سکھایا کہ تدبیر اور دعاء تقدیر کو بدل سکتی ہے۔

تقدیر کے بارے میں جو غلط تصورات اذہان میں قائم تھے اُن کو دور کرنے کا سہرا علامہ اقبالؔ کے سر ہے۔ جب اقبالؔ کے کلام کا بغور مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے تقدیر کے موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے اور اس سلسلے میں تصریحات پیش کی ہیں۔ اس معاملہ میں اقبالؔ کا پیغام یہ ہے کہ تقدیر کا بہانہ بنا کر تدبیر سے ہرگز گریز نہ کیا جائے تاکہ تقدیر اور تدبیر میں کلی طور پر مطابقت اور ہم آہنگی پیدا ہو۔

عمل کو اقبالؔ کے ہاں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ عمل ہی سے زندگی جنت یا جہنم بنتی ہے۔ قرآنِ کریم بھی مکافاتِ عمل اور مجازاتِ عمل ہی کو اہمیت دیتا ہے۔ وَ اَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔

علامہ اقبالؔ کہتے ہیں کہ تقدیر سے کوئی آگاہ نہیں ہے۔ اس لیے تقدیر کا بہانہ بنانا بالکل غلط ہے۔ اس سے بڑی نادانی اور حماقت آبی کیا ہوگی کہ محض تقدیر اور قسمت کے خراب ہونے کو بہانہ بنا کر عمل اور تدبیر سے روگردانی اختیار کر لی جائے:

مری شاکِ امل کا ہے ثمر کیا ؟
تری تقدیر کی مجھ کو خبر کیا؟
کلی گل کی ہے محتاجِ کشود آج
نسیمِ صبحِ فردا پر نظر کیا؟

ooo

حضرت اقبالؔ نے عمل کو مقدم رکھا ہے، اللہ نے نہ کسی کو جنتی بنایا ہے اور نہ جہنمی۔ انسان کا عمل جیسا ہوتا ہے، فیصلہ ویسا ہی کرے گا:

عمل سے زندگی بنتی ہے، جنت بھی جہنم بھی

یہ خاکی اپنی فطرت میں، نہ نوری ہے نہ ناری

اقبالؔ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ وہ اس قدر اسلام پر عمل پیرا ہو جائیں کہ وہ اپنی خودی کو اللہ کے منشاء کے مطابق ڈھال لیں اور مردِ مومن کی رضامندی ہی اللہ کی رضامندی ہو اور تدبیر سے اپنے آپ کو امین بنائے کہ تقدیر اس کے موافق ہو:

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟

خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟

عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں

تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟

اقبالؔ کہتے ہیں کہ اگر ہم اپنی خودی کی تربیت کریں، اسلام پر کامل طور پر عمل کریں تو خدا ہم سے خود پوچھے گا کہ بتاؤ تمہاری تقدیر کیا ہو؟

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

علامہ اقبالؔ کہتے ہیں کہ تدابیر اختیار کرو اگر ان میں ناکام ہو جاؤ تو دوسری تدبیریں استعمال کرو۔ بہر حال تقدیر کا بہانہ نہیں بنانا چاہیے:

تو اگر تقدیرِ نو خواہی رواست

زانکہ تقدیراتِ حق لا انتہاء است

علامہ اقبالؔ نے جاوید نامہ میں تقدیر کی اس بحث کو بہت اجاگر کیا ہے۔ مثال کے طور پر جاوید نامہ کے دو شعر پیش ہیں:

ارضیاں نقدِ خودی در باختند

نکتۂ تقدیر را نہ شناختند

رمزِ باریکش بحرفی مضمر است

تو اگر دیگر شوی او دیگر است

اگر انسان اللہ تبارک و تعالیٰ کی کامل اطاعت کرے اور ہر طرح اس کی فرمانبرداری کرے تو اس سے خوش ہوتے ہیں۔ اور جب ہم اللہ کے ہو جائیں تو اللہ ہمارا ہو جائے گا۔ من کان للہ، کان اللہ لہٗ۔ اقبالؔ کہتے ہیں جب بندہ اللہ کی مرضی کو مقدم جان کر اپنی مرضی کو اس کا تابع کر دیتا ہے تو اللہ خوش ہو کر اپنی مرضی اس کی مرضی کے مطابق کر دیتا ہے:

در رضایش مرضیٔ حق گم شود

این سخن کہ باور مردم شود

اور جب بندۂ مومن اپنی خودی کو مومن بنا لیتا ہے تو اس کی مرضی خدا کی رضامندی ہوتی ہے۔ اور دونوں میں مطابقتِ تامہ ہوتی ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کو خود بندۂ مومن کی رضا عزیز ہوتی ہے۔ یہ دو شعر دیکھیے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اور اس مردِ مومن کی نگاہ، تقدیر کو بھی بدل دیتی ہے:

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اقبالؔ ہمیں اسلاف کو نمونہ بنانے کی تلقین کرتے ہیں، ہمارے اسلاف، تدبیر پر ایمان رکھتے ہوئے تقدیر اختیار

کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی خودی کو مسلمان بنا لیا تھا۔ وہ لوگ تقدیر کا بہانہ نہیں بناتے تھے۔ ان کی تائید اللہ تعالیٰ کرتا تھا اور اسی وجہ سے وہ لوگ جدھر گئے، کامران اور بامراد واپس ہوئے:

تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

اقبالؔ فرماتے ہیں کہ قوم کی تقدیر ان کے افراد کے ہاتھوں میں ہوتی ہے اور اگر یہ لوگ چاہیں تو اسے بنا بھی سکتے ہیں اور بگاڑ بھی سکتے ہیں:

افراد کے ہاتھوں میں اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ
محروم رہا دولتِ دریا سے وہ غواص
کرتا نہیں جو صحبتِ ساحل سے کنارہ

جو تقدیر کا بہانہ بنا رہے تھے، علامہ اقبال نے ان سے کہا کہ تقدیر کا کسی کو علم نہیں ہے، اس لیے اخلاص کے ساتھ عمل کا آغاز کر دینا چاہیے۔ اور اس مومنانہ فراست کو اپنے اندر پیدا کرنا چاہیے کہ جس سے تقدیر ہی کو بدل سکنے کی طاقت پیدا ہو:

تقدیر امم کیا ہے، کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارہ
اخلاصِ عمل مانگ نیا گانِ کہن سے
شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا

اقبالؔ اپنی ایک نظم احکامِ الٰہی میں مسئلہ تقدیر کو واضح کرتے ہیں کہ تقدیر کی پابندی کا مطلب بغیر تدبیر کئے تقدیر پر راضی بہ رضا ہونا نہیں ہے بلکہ احکام الٰہی پر عمل کرنا اور دعا و تدبیر کے ذریعہ تقدیر کو اپنے لیے سازگار بنانا ہے۔ اور مومن کو ہر حال میں احکامِ الٰہی کا پابند ہوتا ہے:

پابندیٔ تقدیر کہ پابندیٔ احکام
یہ مسئلہ مشکل نہیں اے مرد خردمند
اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر
ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش، ابھی خورسند
تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

اس کے علاوہ ''تقدیر'' کے نام سے ضربِ کلیم میں یہ ایک نظم موجود ہے۔

نااہل کو حاصل ہے کبھی قوت و جبروت
ہے خوار زمانے میں کبھی جوہرِ ذاتی
شاید کوئی منطق ہو نہاں اس کے عمل میں
تقدیر نہیں تابعِ منطق نظر آتی!!
ہاں ایک حقیقت ہے کہ معلوم ہے سب کو
تاریخِ امم جس کو نہیں ہم سے چھپاتی
ہر لحظہ ہے قوموں کے عمل پر نظر اس کی
براں صفت تیغ دو پیکر نظر اس کی

اس نظم میں علامہ اقبالؔ نے یہ بیان کیا ہے کہ نااہل کو بھی نوازا جاتا ہے۔ اور جو اہل ہیں، اور جوہرِ ذاتی کے اوصاف کے حامل ہیں، ان سے بے اعتنائی برتی جاتی ہے۔ تقدیر کے مطابق اعمال ہو رہے ہیں۔ اس کی نہاں منطق ہے۔ سمجھ میں تو نہیں آتی، لیکن اس میں کوئی نہ کوئی

مصلحت پوشیدہ ضرور ہے۔ اقبالؔ تقدیر پر نظر رکھنے کا مشورہ دیتے ہیں اور تقدیر بدلنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اقبالؔ مسلمانوں کی حالت زار پر گریہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلمان تقدیر کا بہانہ کر کے سو گیا ہے۔ جس کا کام جاگنا تھا، وہ خود خوابیدہ و خفتہ ہے۔ ع

تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب

علامہ اقبالؔ وحدتِ ادیان کے قائل نہیں۔ وہ اپنے اشعار میں مومن اور کافر کے درمیان فرق کو واضح کرتے، مندرجۂ ذیل اشعار میں نظریۂ تقدیر جو اسلامی ہے اور غیر اسلامی ہے اسے پیش کیا ہے۔ اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ تدبیر اہم ہوتی ہے۔

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
کافر ہے تو تابعِ تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

مومن بذاتِ خود تقدیر الٰہی ہے۔ لہٰذا تقدیر کا بہانہ نہیں بنانا چاہیے۔ جد و جہد اور حرکت و عمل پر کمر بستہ ہو جانا چاہیے۔ اگر تدبیر نہ کرے گا تو حالات کا خود ذمہ دار ہو گا۔

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا، خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

علامہ اقبالؔ فرماتے ہیں کہ تمام وسائل اور ذرائع موجود ہیں مگر تدبیر سے دوستی اس قدر ہے کہ ان وسائل کو استعمال کرنا نہیں چاہتے۔ اگر ان اسباب کو اختیار کریں گے تو پھر تقدیر کا بہانہ کیسے بنا سکیں گے۔ ہوائیں ان کی، فضائیں ان کی، سمندر ان کے، جہاز ان کے گرہ بھنور کی کھلے تو کیوں کر، بھنور ہے تقدیر کا بہانہ!

اقبالؔ کہتے ہیں کہ اگر اپنی نگاہ کو مومن بنا لیا جائے تو تقدیر کی گہرائیاں نظر آئیں گی:

نظر آئیں مجھے تقدیر کی گہرائیاں اس میں
نہ پوچھ اے ہمنشیں مجھ سے وہ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

علامہ اقبالؔ نوجوانانِ امت کو مردِ مومن کی مثالی شخصیت پیش کر کے اس کی طرح عمل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اپنے جنوں سے تقدیر کے پردہ کو چاک کو سی دیتا ہے:

ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے
جس نے سیئے ہیں تقدیر کے چاک

اقبالؔ کی بصیرت دیکھیے کہ فرماتے ہیں ''افراد کا یقین ہی وہ شئے ہے جس سے ملت کی تعمیر ہوتی ہے اور اسی قوت سے تقدیر بنتی ہے:

یقین افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

خود کو تقدیر کا زندانی سمجھنا' اقبالؔ کی نظر میں نادانی ہے۔ نادان خود کو تقدیر کے دام میں گرفتار سمجھتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس میں تقدیر شکن قوت موجود ہے۔

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں
ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی

ooo

اقبالؔ کا خیال ہے اگر چشم دل وا ہو تو تقدیر بے حجاب ہو جاتی ہے۔

کہہ رہا ہے مجھ سے اے جویائے اسرارِ حیات
چشمِ دل وا ہو تو تقدیرِ عالم بے حجاب

اس طرح علامہ اقبالؔ تقدیر کے اسرار و رموز کو بے حجاب کر کے تدبیر اختیار کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اور انہیں یہ یقین بھی ہے کہ مسلمانوں نے ان کے پیغام کو سن لیا ہے۔ اور ضرور بہ ضرور تدبیر اختیار کریں گے اور تقدیر کا بہانہ نہیں بنایا جائے گا:

توڑ ڈالے گی یہی خاکِ طلسمِ شب و روز
گرچہ کچھ الجھی ہوئی تقدیر کے پیچاک میں ہے

علامہ اقبالؔ اپنی بصیرت سے گہرائیوں اور پنہائیوں میں ڈوب کر تقدیر کو تدبیر پر موقوف قرار دیتے ہیں:

نظر آئیں مجھے تقدیر کی گہرائیاں اس میں
نہ پوچھ اے ہمنشیں مجھ سے وہ چشم سرمہ سا کیا ہے
ذرا تقدیر کی گہرائیوں میں ڈوب جا تو بھی
کہ اس جنگاہ سے میں بن کے تیغ بے نیام آیا
تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں
نادان جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی

علامہ فرماتے ہیں کہ میرے تفکر میں انجم اور ستارے بنتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر محمد ریاض'' پیغام اقبال بے شک عالمگیر ہے، مگر مسلمان معاشرہ اور ملت کا اس میں ایک خاص مقام ہے۔ حکیم الامت کی بصیرت، امت مسلمہ کے لئے مینارۂ نور رہے، اس لیے تقدیر امت کے ضمن میں ان کے ارشادات قابلِ غور ہیں:

بنتے ہیں مری کار گہِ فکر میں انجم
لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان

علامہ فرماتے ہیں کہ اگر یقین پختہ ہو، خودی مسلماں ہو تو یہی چیزیں تقدیر ساز ہیں:

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی کر سکتا ہے اندازہ اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اور یقین ہی ملت کی تعمیر میں سرمایہ کا کام دے سکتا ہے، جو کہ تقدیر کا صورت گر ہے:

یقین افراد کا سرمایۂ تعمیر ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے

علامہ اقبالؔ کی تشخیص کے مطابق تقدیر امم کے تین عناصر ہیں:

دفعتاً جس سے بدل جاتی ہے تقدیرِ امم
ہے وہ قوت کہ حریف اس کی نہیں عقلِ حکیم
ہر زمانے میں دگرگوں ہے طبیعت اس کی
کبھی شمشیرِ محمدؐ ہے کبھی چوبِ کلیم

ضربِ کلیم میں نظم'' آج اور کل'' میں علامہ اقبالؔ تقدیر ساز اور تقدیر شکن اقوام کا طرزِ عمل یوں بیان کرتے ہیں:

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے
جو قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

زندہ قومیں تقدیر کا بہانہ بنا کر تدبیر سے جی نہیں چراتیں، بلکہ جہدِ مسلسل اور عملِ پیہم ان کا شیوہ ہوتا ہے اور یہ اقوام اپنے عمل سے تقدیروں کو بھی بدل کر رکھ دیتی ہیں:

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح وشام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

قوموں کی تقدیر کو بدلنے والی چیز یہ ہے کہ جدتِ عمل اور جدتِ کردار پیدا ہو جائے۔ جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع ہو۔ ندرتِ فکر وعمل اور تدبیر سے جب کام لیا جاتا ہے، تو یہی تقدیر کی تبدیلی ہے۔ نپولین کے مزار پر اقبالؔ کہتے ہیں:

راز ہے، راز ہے، تقدیر جہانِ تگ وتاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز
جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع!!
کوہِ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز
جوشِ کردار سے تیمور کا سیلِ ہمہ گیر
سیل کے سامنے کیا شئے ہے نشیب اور فراز

نپولین کے بعد نظم ''مسولینی'' سے یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

ندرتِ فکر وعمل کیا شئے ہے، ذوقِ انقلاب
ندرتِ فکر وعمل کیا شئے ہے، ملت کا شباب
ندرتِ فکر وعمل سے معجزاتِ زندگی!!
ندرتِ فکر وعمل سے سنگِ خارا، لعلِ ناب

اور یہی وہ اسرار ہیں جو جوشِ عمل سے کھل جاتے ہیں کہ تقدیر کیا ہے، تقدیر کیسے بدل سکتی ہے۔ ''مکالمہ مرید ہندی و پیر رومی'' میں تقدیر امم پر بہت سے خیالات کا اظہار کیا ہے اور بہت بصیرت افروز جائزہ لیا ہے۔ علامہ نے اپنے شہرۂ آفاق ''جاوید نامہ'' میں تقدیر کے بارے میں 'زندہ رود' حضرت جلال الدین رومیؔ سے ''افتادن تجلی جلال'' کہلواتے ہیں:

یورشِ ایں مردِ ناداں در پذیر
پردہ را از چہرۂ تقدیر گیر
انقلابِ روس و آلمان دیدہ ام
شور در جان مسلمان دیدہ ام
دیدہ ام تدبیر ہائے غرب و شرق
وا نما تقدیر ہائے غرب و شرق

اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد ریاض لکھتے ہیں:

''۔۔۔دانائے راز نے جاوید نامہ میں اس کتاب کے دوسرے فلک سے شاعر کا نام زندہ رود یاد رکھنا چاہیے۔ تقدیر امم پر بھرپور بحث کی ہے۔ ندائے جمال نے انہیں امت مسلمہ کے بارے میں بتایا کہ مسلمانوں کے ضعف وانحطاط کا بڑا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں نے دین کے اساس اول کے تقاضے سے منہ موڑ رکھا ہے۔ علامہ نے جو حرکت و عمل کا تصور ہمیں دیا ہے اور عمل پر ابھار کر سستی و کاہلی سے دور ہونے کا پیغام ہمیں دیا ہے، وہ علامہ کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ جمود و تعطل کے دور میں عمل کا پیغام دینا صرف اقبال ہی کے بس کی بات تھی۔ اگر تقدیر کو بدلنے کا ارداہ نہ ہو تو تقدیر بدلے گی بھی نہیں۔''

علامہ اقبالؔ کے خیال میں قرآنِ مجید میں قوموں کے عروج وزوال اور تقدیرِ امم کو اسرار و رموز اور معارف و حِکم موجود ہیں۔ کہتے ہیں:

جو سرمۂ رازی زا از دیدہ فروشستم
تقدیر امم دیدم، پنہاں بہ کتاب اندر

اقبالؔ نے ’ مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق‘ میں امتوں اور قوموں کی تقدیر کو بیان کیا ہے اور عروج وزوال کے نتائج کو تدبیر کرنے اور نہ کرنے پر موقوف بتایا ہے۔ بقول شخصے: ’’۔۔۔۔مثنوی پس چہ باید کرد، تقدیر امم کا آئینہ خانہ کہی جاسکتی ہے۔‘‘ اقبالؔ کہتے ہیں کہ اگر کوئی خودی سے واقف ہوجائے اور وہ اپنی خودی کو مسلمان بنالے تو خود بخود تقدیر کے اسرار کھل جائیں گے اور جو لوگ تدبیر اختیار نہیں کرتے بلکہ تقدیر کا بہانہ کرتے ہیں، وہ اپنی خودی سے ناواقف ہیں۔

علامہ اقبالؔ فرماتے ہیں کہ مومن پابند تقدیر نہیں ہوتا بلکہ احکامِ الٰہی کا پابند ہوتا ہے۔ مومن خود تقدیر بنانے والا، تقدیر ساز اور خلّاقِ تقدیر ہوتا ہے:

عزم او خلاقِ تقدیرِ حق است
روزِ ہیجا تیر او تیرحق است

علامہ اقبالؔ پیامِ مشرق میں فرماتے ہیں:

بپا ی خود مزن زنجیر تقدیر
تہ ایں گنبد گرداں رہی ہست
اگر باور نداری خیزو دریاب
کہ چون پاواکنی جولانگہی ہست

علامہ اقبالؔ نے جس بات پر بہت زور دیا ہے وہ ’خودی‘ ہے۔ ان کے خیال میں خودی کا عرفان اور خودی کو پہچان لینا انسان کے لیے ایک بڑی دولت ہے اور جو شخص خودی سے واقف اور خود آگاہ ہوگا، وہ ضرور تدبیر اختیار کرے گا۔ اور اگر وہ تدبیر اختیار نہ کررہا ہو، تقدیر کو رورہا ہو تو وہ یقیناً خودی سے ناواقف ہے بلکہ وہ اپنی خودی سے انصاف نہیں کرنے والا ہے:

اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف

اقبالؔ کے سوزِ دروں اور تقدیر کے مسئلہ میں ملت کے رویہ پر ان کے کرب کا اظہار اس شعر سے ہوتا ہے:

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا، خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں، بنا کے تقدیر کا بہانہ

ooo

الحاصل، علامہ اقبالؔ نے اپنی ساری توجہ اس امر پر مرکوز کی ہے کہ امتِ مسلمہ تقدیر کے غلط مفہوم کو ترک کردے اور تدبیر اختیار کرے۔ علامہ کے کلام میں جا بجا اس کو بیان کیا گیا ہے۔ انھوں نے اس موضوع کو بڑی خصوصیت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ تدبیر کیا ہوگی؟۔ تدبیر یہی ہوگی کہ احکامِ الٰہی پر پوری طرح عمل کیا جائے اور اسی کی رضا طلب کی جائے۔ عدمِ تدبیر، تقدیر کے غلط تصور اور ناقص فہم کی وجہ سے ہے:

پابندئ تقدیر کہ پابندئ احکام
یہ مسئلہ مشکل نہیں اے مردِ خردمند
اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر
ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش، ابھی خرسند
تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند!!

☆☆☆

ڈاکٹر محمد ناظم علی
نظام آباد

اقبال اور عظمت انسانی

علامہ اقبال نے ایک منظّم ومبسوط فلسفہ حیات اپنی شاعری کے ذریعے پیش کیا۔اقبال اردو کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے فلسفیانہ فکر کو اعلیٰ ترین شعریت سے ہم آہنگ کردیا۔اقبال جس شاعرانہ اور والہانہ انداز سے عظمت انسانی کے گن گاتے ہیں وہ انہیں عالم انسانیت کا عظیم شاعر بنا دیتا ہے۔اقبال کی شاعری اور فلسفہ کا محور خودی' عشق اور عمل ہے۔ان موضوعات کو انہوں نے جس شاعرانہ کمال کے ساتھ بیان کیا ہے وہ انہیں اردو شاعری میں عظمت واحترام کے اس مقام پر پہونچا دیتا ہے جہاں اردو کے بہت کم شاعروں کو رسائی ہوتی ہے۔اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے انسان کی عظمت کو اجاگر کیا ہے اور وہ انسان کو خودی کی معراج پر دیکھنا چاہتے ہیں۔علامہ اقبال نے جہاں اپنے کلام میں انسان کی جہالت، وحشت و درندگی، خودی ناشناسی اور تخریبی اندازِ فکر کا ذکر کیا ہے وہاں اس نے انسانی عظمت کے پہلو کو بھی اُجاگر کیا ہے۔ان کی متوازن فکر ہمیشہ اشیاء اور نظریات کے اچھے اور بُرے پہلوؤں سے آگاہ رہتی ہے۔وہ اچھائی کی مدح سرائی کرتے ہیں اور بُرائی کو ہدفِ تنقید بنانے سے باز نہیں رہ سکتے۔انسان کے بارے میں بھی ان کا یہی رویہ ہے۔یہاں اس بات کی صراحت ضروری ہے کہ عظمتِ انسانی سے متعلق ان کے نظریات کافی حد تک قرآنی تصورِ انسان پر مبنی ہیں۔اقبال نے جس انسان کی عظمت بیان کی اس کے بارے میں بدقسمتی سے ہمارے عام لوگ انسان کو کبھی نطفہ غلیظ کی پیداوار قرار دیتے ہیں تو کبھی خاکی پتلا قرار دیتے ہیں۔کبھی اس کو گندگی کے ڈھیر سے تعبیر کرتے ہیں تو کبھی اس کو کائنات میں ایک حقیر کیڑے سے زیادہ بلند حیثیت دینے پر آمادہ نہیں ہوتے۔یہ سب کچھ اُس ہستی کے بارے میں کہا جاتا ہے جسے اللہ نے اپنے کمال قدرت سے بنایا ہے اور پھر اُس کے قالب میں ''اپنی'' روح پھونک کر کارخانہ قدرت میں سب سے خوبصورت اور سب سے عظیم الشان ہستی کا اضافہ کیا۔پھر اُس کو سب کچھ سے نوازا جن پر خود اللہ کو ناز ہے۔مثلاً اللہ سراپا علم ہے۔اُس نے انسان کو علم کی دولت سے مالا مال فرمایا۔اللہ سراپا حسن ہے اور اُس نے انسان کو خوبصورت ترین سانچے میں ڈھالا۔اللہ سجدہ کے لائق ہے اور اُس نے انسان کو مسجود ملائک بنایا۔اللہ خالق ہے۔اُس نے انسان کو ایجاد کی خوبی سے سرفراز فرمایا۔اس دنیا کو اور جو کچھ اس میں ہے کو انسان کی خاطر پیدا فرمایا اور خود انسان کو

اپنے لیے:

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے

جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

اقبال چاہتے تھے کہ انسان اشرف المخلوقات بنائے جانے کے اپنے منصب پر پورا اترے اور نیابت الٰہی کی جو امانت اسے سونپی گئی اس فریضے کو بخوبی انجام دے۔ وہ کہتے ہیں کہ اپنے تمام نقائص ومعائب کے باوجود انسان دیگر مخلوقات سے افضل واعلیٰ ہے، کیونکہ وہ اُس امانت الٰہی کا حامل ہے جسے قرآن کے الفاظ میں آسمانوں، زمین اور پہاڑوں نے بھی اٹھانے سے انکار کر دیا تھا‘‘۔ یہ چیز انسان کو دیگر مخلوقات پر برتری عطا کرتی ہے۔ انسان کی عظمت کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ اسے ’’امانت الٰہی‘‘ کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ اس امانت الٰہی کی حقیقی نوعیت کے بارے میں مختلف نظریات پیش کئے جاتے ہیں۔ علامہ اقبال کی نگاہ میں ’’امانت الٰہی‘‘ سے مراد خودی کی تربیت اور اس کا استحکام ہے۔ تمام کائنات میں سے صرف انسان کو عقل وشعور اور آزادی انتخاب کی نعمت دی گئی۔ جمادات، نباتات اور حیوانات میں عقلی سرگرمی، شعوری کوشش اور خیروشر کو اختیار کرنے کی صلاحیت اور آزادی انتخاب کی صفات موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہستی کے ادنیٰ مدارج میں ہیں۔ علم، فکر، شعوری عمل اور آزادی کو بروئے کار لا کر انسان نہ صرف مادی ترقی کے مراحل طے کر سکتا ہے، بلکہ وہ روحانی بلندیوں کو بھی حاصل کر کے خلیفۃ اللہ علی الارض بن سکتا ہے۔ اگر انسان غور وفکر اور علم سے کام نہ لے تو وہ کبھی بھی مظاہر فطرت کے گہرے مطالعہ ومشاہدہ کی بدولت قدرت کی طاقتوں کو مسخر کرنے کا اہل نہیں ہو سکتا۔ اس علمی صلاحیت کی بنا پر وہ خدا تعالیٰ کی نشانیوں کو خارجی دُنیا میں تلاش کرتا ہے اور اپنے علمی نتائج کی بنیاد پر سائنس کے میدان میں حیرت انگیز ترقی بھی کرتا ہے۔ اور اس کائنات کے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھاتا ہے۔ کیا یہ قرآنی حقیقت نہیں کہ علم کی بدولت ہی آدم کو فرشتوں پر برتری دی گئی تھی؟ علامہ اقبال کا یہ تصور بھی کس قدر درست دکھائی دیتا ہے کہ ’’نیکی کے لئے آزادی شرط ہے‘‘۔ اگر خدا تعالیٰ نے انسان کو خیروشر کی تمیز کی صلاحیت اور آزادی انتخاب سے نہ نوازا ہوتا تو اس میں اور مشین میں پھر کیا فرق ہوتا؟ یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ مشین اپنی مرضی اور آزادی سے حرکت نہیں کرتی، بلکہ اس کی حرکت کسی اور کی محتاج ہوتی ہے۔ اگر انسان کی حرکات وسکنات بھی مشین کی طرح بلاارادہ ہوتیں تو وہ اپنے اچھے اور بُرے اعمال کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ بازپُرس تو اُسی سے کی جا سکتی ہے جسے کوئی ذمہ داری بھی سونپی گئی ہو اور نیکی اور بدی کے انتخاب کی آزادی بھی دی گئی ہو۔ انسانی عظمت کا یہ پہلو بھی علامہ اقبال کے کلام میں جا بجا بیان کیا گیا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ انسان خدا کی برگزیدہ مخلوق، زمین پر اس کا نائب اور آزاد شخصیت کا امین ہے۔ انسانی عظمت کے ان مختلف گوشوں کو اقبال نے اپنی شاعری میں بھی موضوعِ سخن بنایا ہے۔

اقبال اپنی ایک نظم ’’روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے‘‘ میں انسانی عظمت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوہ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
ایامِ جدائی کے ستم دیکھ، جفا دیکھ
بے تاب نہ ہو معرکہ بیم و رجا دیکھ
خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اِک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

کائنات کے حسن و جمال میں اضافہ کرنے اور اسے ترقی وارتقاء کے مراحل سے گزارنے میں انسان نے محض اپنے علم پر ہی تکیہ نہیں کیا، بلکہ اپنی سعی مسلسل، عمل پیہم، محنت شاقہ اور جفاکشی کو بھی اختیار کیا ہے، قدرت نے سفال کو پیدا کیا، مگر انسان نے اپنی محنت وذہانت سے کام لے کر اسے جام کی شکل دی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے اس ریگستانِ کائنات کو گل وگلزار بنانے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اس طرح انسان نے اپنی تخلیقی سرگرمیوں سے ثابت کر دیا ہے کہ دُنیا کی ہما ہمی اور ترقی میں اس کا بھی کردار ناقابلِ فراموش ہے۔ قرآن حکیم میں خداتعالیٰ نے اپنے آپ کو ''احسن الخالقین'' کہا ہے۔ نائب حق ہونے کے لحاظ سے انسان بھی چھوٹے پیمانے پر تخلیق کار ہے۔ اگر وہ محض کٹھ پتلی بنا کر بھیجا جاتا تو پھر وہ کیسے تخلیقی سرگرمیوں کا حامل ہوسکتا تھا۔ اقبال ان مفکرین میں سے ہیں، جنہوں نے انسانی عظمت اور انسانی صفات کے گیت گائے ہیں، خداتعالیٰ نے انسان کو بہت سی ذہنی صلاحیتوں سے نوازا ہے، جن کی بدولت وہ تسخیرِ کائنات کے قابل ہوسکا ہے۔ اسے یہ بلند مقام یونہی نہیں مل جاتا، بلکہ اسے اپنے بلند مقاصد کے حصول کے لئے ہر قسم کی مشکلات اور موانعات کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اگر وہ جذبہ ترقی اور ذوق انقلاب سے عاری ہو جائے تو وہ بلاشبہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لاسکتا۔ یہ جذبہ ترقی ہی ہے، جس نے اسے جفا کش، بلند ہمت، انقلاب آفرین اور ارتقا پذیری کی صفات سے آشنا کر کے دُنیا کی رعنائی اور ترقی کے قابل بنا دیا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دُنیا کی تمام ہماہمی اور نئی ایجادات اسی جذبہ انقلاب کی مرہون منت ہیں۔ اقبال انقلاب کے ذوق کی اہمیت پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
روحِ اُمم کی حیات، کشمکش انقلاب

ذہنی صلاحیتوں کے مناسب استعمال، جفاکشی، خواہش ترقی، مقاصد آفرینی اور انقلاب پسندی کے سبب انسان حیوانی سطح کی زندگی سے بلند ہوکر بقائے دوام اور شہرتِ عام کا مستحق بن جاتا ہے۔۔ اب یہ خود انسان پر منحصر ہے کہ وہ اپنے خداداد علم، مخفی صلاحیتوں اور طاقت کو نبی نوع انسان کی فلاح، تعمیر جہاں اور نیکی کی خاطر استعمال کرتا ہے یا ابلیسی اور تخریبی مقاصد کے لئے خالق کائنات نے اسے اپنی الہامی تعلیمات اور انبیائے کرام کی وساطت سے صراطِ مستقیم کا پتہ بتا دیا ہے اور ساتھ ہی اسے غلط روش کے تباہ کن نتائج سے بھی آگاہ کر دیا ہے۔ اچھے اور بُرے انتخاب عمل کے مطابق ہی

اسے سزا و جزا کا مستحق قرار دیا جائے گا۔ دراصل اس کے اپنے اعمال ہی اسے جنت اور جہنم کی طرف لے جائیں گے۔ بقول اقبال

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

شاعر کی نظر میں انسان کا مقام سوائے اللہ کے ہر چیز سے بلند ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان کو زمینی زندگی بہت مختصر عطا کی گئی ہے۔ اس مختصر زندگی میں وہ عملِ پیہم کے ذریعے آگے ہی آگے بڑھتا جارہا ہے۔ اقبال انسان کو یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ اللہ نے انسان کے لیے جو اعلیٰ ترین معیار اور بلند ترین مقام پسند فرمایا ہے وہاں اللہ تک پہنچنے کے لیے سعی مسلسل کی ضرورت ہے اور انسان کو چاہیے کہ وہ مہد سے لحد تک اس مقام تک پہنچنے کے لیے انتھک جدوجہد اور سفر کرتا رہے:

ہر ایک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

رہی یہ بات کہ انسان کو اس مشکل اور پُر خار سفر کے دوران کیا سامان کرنا چاہیے اور کیا زادِ راہ اپنے پاس رکھنا چاہیے تاکہ وہ اس بلند مقام تک رسائی حاصل کرسکے جو خداوند تعالیٰ نے اس کے لیے مقرر کیا ہے۔ اقبال کی نظر میں اولین شرط یہ ہے کہ آدمی کو سب سے پہلے اپنے آپ کو پہچاننا چاہیے کہ وہ کون ہے، کیا ہے، اُس کا مقصدِ تخلیق کیا ہے، وہ کیا مقاصد ہیں جن کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو زمین پر بھیجا، کائنات میں اس کا مقام کیا ہے اور خدا کی دیگر مخلوقات کے ساتھ اس کی نسبت کیا بنتی ہے۔ ان تمام تفاصیل کا اجمالی نام ''خودی'' ہے۔ اگر انسان اس خودی کی پرورش کرسکا تو خاک و خون کا یہ چھوٹا سا جاندار جسے عرف عام میں انسان کہتے ہیں ایک ایسے لافانی شعلے کی حیثیت حاصل کرلے گا جو اپنے اردگرد باطل کی تمام خس و خاشاک کو جلا کر راکھ کر دینے کی صلاحیت کا متحمل ہوگا اور خود کندن بن کر لازوال ہو جائے گا:

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف
کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ ہمہ سوز!

اقبال ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اگر انسان واقعی قیمتی بننا چاہتا ہے اور بلند مقام پر فائز ہونے کی آرزو رکھتا ہے تو اُس کو اپنی خودی کی حفاظت کرنی ہوگی ورنہ اس کا مقام بھی دوسرے جانداروں سے مختلف نہیں ہوگا:

گراں بہا ہے تو حفظِ خودی سے ہے، ورنہ
گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں

عظیم بننے اور خدا کے متعین کردہ مقام پر متمکن ہونے کے لیے اقبال ہمیں ایک اور گُر سے روشناس کراتا ہے۔ وہ ہے گریہ نیم شبی اور اپنے خالق، مقصد تخلیق کائنات، مقصدِ زیست اور ان تمام چیزوں کے ساتھ اپنے تعلق و نسبت کے بارے میں عمیق غور و فکر۔ اگر انسان یہ سب کرسکا اور پھر حاصل کردہ افکار کی روشنی میں سفرِ حیات پر چل پڑا تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اُس مقام پر کمند نہ ڈال سکے جو اُس کے لیے متعین شدہ ہے۔ دھیرے دھیرے یہی خاک سے عبارت انسان وہ رفعت حاصل کرلے گا کہ بلند آسمان کے بلند ستارے زمین کے بظاہر پست انسان کی بلند پروازی سے خائف ہو جائیں گے:

عظمت انسانی کے بیان کے علاوہ فکر اقبال کے کئی

روشن پہلو ہیں۔ ان کے علم کی گہرائی‘ فکروخیال‘ انداز بیان‘ اسلوب‘ حکمت وتربیت کا انداز انوکھا ہے۔ دوسرے ان کی ان خصوصیات تک نہیں پہونچ سکتے۔علامہ اقبال نے ایسے نظریات کی تلاش کی جو رنگ ونسل اور علاقائی امتیاز سے اوپر اٹھ کر اخوت‘ بھائی چارگی اور مساوات کی تعلیم دیتے ہیں۔انہوں نے مغربی مفکرین وفلسفیوں جیسے کانٹ‘ رابرٹ براؤننگ‘ گوئٹے‘ نیٹشے‘ ٹالسٹائی‘ کارل مارکس‘ ہیگل اور برگساں وغیرہ کا گہرا مطالعہ کیا۔وہ ان سے متاثر تو ہوئے لیکن ان کے نظریات کو جوں کا توں قبول نہیں کیا۔انہوں نے مغرب کی وطنیت‘ قومیت اور فریب کارانہ معاشرتی وسیاسی اصطلاحات کا راز فاش کیا۔اور اپنی نظم ونثر کے ذریعے محبت‘یقین وعمل کا پیغام دیا۔فلسفہ خودی کی تعلیم دے کر مشرق کے حالات وواقعات کو مدنظر رکھ کر قوم وملت کو اپنی شاعری اور نثر نگاری کے ذریعے باخبر اور ہوشیار کیا۔اور انہیں حالات کا مقابلہ کرنے اور امت کی بے راہ روی کو ختم کرنے کے راستے بتائے۔انہوں نے اپنے کلام میں ہندومسلم اتحاد پر بھی زور دیا۔ترانہ ہندی‘ نیا شوالہ‘ ہمالہ‘ ترانہ ملی اور سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا جیسی نظمیں لکھ کر وطن سے اپنی اٹوٹ محبت کا اظہار کیا۔انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے حب الوطنی اور ہندوستان سے محبت کا بھی درس دیا۔اور اپنی تمام تر شاعری میں سادہ‘ سلیس اور پرمعنی الفاظ میں اپنے دل کی بات کہی ہے۔انہوں نے کبھی قوم کو یکجا ہوکر اپنے مادر وطن کی خدمت کرنے کا درس دیا تو کبھی ان کی خودی کو ابھارا۔ان کی ہر نظم بلکہ ہر شعر کو دیکھئے جس میں ہمیں بنی نوع انسان سے محبت اور انسانیت سے انسیت کا سبق ملے گا۔

قوم کو جہد مسلسل اور عمل پیہم کی ترغیب وتعلیم دیتے ہوئے اقبال انسان کو ناامیدی اور مایوسی سے کنارہ کشی اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں:

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی
یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اقبال قوموں کی ترقی اور خوشحالی کو سخت محنت اور جہد مسلسل میں تلاش کرتے ہیں۔اور انسان سے مخاطب ہیں۔اس کے علاوہ ان کی شاعری میں حیات کی تربیت کا درس اور خودی کا پیام ملتا ہے۔انہوں نے کائنات کو اسیر کرنے کے جو طریقے بتائے ہیں وہ بہت گہرے مطالعے کا نتیجہ ہیں اور اقتضائے وقت کے لحاظ سے نہایت موزوں اور مناسب ہیں۔ اقبال ترک دنیا ترک خودی کے قائل نہ تھے۔وہ ان خیالات کی شدت سے مخالفت کرتے ہیں۔انہیں یقین تھا کہ جب یہ عقائد کسی قوم میں جگہ پالیتے ہیں تو وہ قوم بہت جلد فنا ہوجاتی ہے جن قوموں میں احساس خودی ہوتا ہے وہ دنیا پر حکمرانی کرتی ہیں۔

خودی کی خلوتوں میں مصطفائی
خودی کی جلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی
خودی کیا ہے راز درون حیات
خودی کیا ہے بیداری کائنات

☆☆☆

سید محبوب قادری

اُستاد جامعہ نظامیہ
شبلی گنج، حیدر آباد (تلنگانہ)

نظم عقل ودل ایک مطالعہ

یہ نظم سر محمد اقبال کے فن کی ایک جھلک ہے ۔کون اقبال ؟ وہی جس نے فلسفہ جیسے کھٹن شے کو شاعری جیسی نازک فن میں بھرپور استعمال کر کے ساری دنیا کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ وہی اقبال جو مردہ جسموں میں زندگی کی روح پھونکتا ہے ۔وہی جس کی شاعری میں انسانیت کا دل دھڑکتا ہے ۔ وہی اقبال جس نے اردو نظم نگاری کو بام عروج پر پہونچایا۔ ایسے معتبر استاد سخن کی شاعری پر گفتگو کرنے کیلئے اقبال اور اقبالیات سے اچھی گہری بصیرت اور بصارت والا فن کار ادیب ہی کچھ گفتگو کرسکتا ہے ۔اور اقبال کا عندیہ جو الفاظ کے جامہ میں معانی ومفاہیم کا ایک بحر مطلاطم موج زن ہے اس میں سے کچھ قطرے حاصل کرسکتا ہے۔

میں ایک طالبعلمانہ حیثیت سے ''نظم عقل و دل'' کے جو معانی و مفاہیم سمجھ میں آتے ہیں ظاہر کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔

سر محمد اقبال کی کوئی بھی صنف سخن حمد، نعت، نظم، غزل، رباعی اور قطعہ وغیرہ کے معانی ومفاہیم واضح کرنے سے پہلے یہ جان لینا بے حد ضروری ہے کہ اقبال کا عندیہ اور نظریہ کیا ہے ۔ان کی شاعری کے وہ کیا عناصر ہیں جو اقبال کو دیگر شعرا سے ممتاز کرتے ہیں:

اقبال کی شاعری کی عمارت چار عناصر پر قائم ہے

(۱)عشق (۲) خودی (۳) مردمومن (۴)عمل

اقبال کے پاس ''عشق'' کا تصور وہ نہیں ہے جو دیگر شعرا اور انسانوں کے پاس ہے، بلکہ اقبال کے پاس ''عشق'' کا تصور بہت گہرا اور پاک ہے یعنی وہ ایک جذبہ ہے، اسی وجہ سے اقبال کہتے ہیں کہ:

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل محو ے تماشہ ہے لب بام ابھی

اقبال کی شاعری کا دوسرا ستون ''خودی'' ہے اقبال کے پاس خودی کا تصور نفس پرستی اور انا کی تسکین نہیں ہے بلکہ انسان میں پوشیدہ صلاحیت و ہنر ہے، اسی وجہ سے اقبال کہتے ہیں کہ:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اقبال کی شاعری کا تیسرا ستون ''مردمومن'' ہے۔مردمومن سے مراد اقبال کے پاس وہ شخص ہے جو اپنے مقصد اور کامیابی کے لئے ثابت قدمی، صبر اور استقلال سے

کام لیتا ہے اور اپنے مقصد سے کبھی دور نہیں ہوتا اسی وجہ سے اقبال کہتے ہیں کہ:

یقین محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم

جہاد زندگانی میں یہ ہے مردوں کی شمشیریں

اقبال کی شاعری کا چوتھا ستون ''عمل'' ہے۔ یعنی اقبال کے پاس عمل کا تصور حرکت ہے، اسی لئے اقبال کے پاس موت کا جو تصور ہے وہ جسم سے روح کا نکلنا نہیں ہے بلکہ اسے کہیں زیادہ گہرا اور وسیع ہے اور وہ ہے منجمد ہونا یا حرکت نہ کرنا ہے۔

اب جب کہ ہم نے اقبال کی شعری خواص سے واقفیت حاصل کر لی ہے اصل مضمون کی طرف لوٹتے ہیں۔

اقبال کی نظم ''عقل و دل'' کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو بظاہر کچھ خاص نظر نہیں آتی، لیکن جب قاری ناقدانہ نظر سے اس نظم کا مطالعہ کرتا ہے تو اس پر معانی و مفاہیم کے کئی جہات نظر آتے ہیں، جس سے قاری کو بصارت اور بصیرت میسر ہوتی ہے۔

عقل و دل کی چند ایک خصوصیات درجہ ذیل ہیں:

اس نظم کے عنوان سے ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو متضاد الفاظ ایک جا جمع کئے گئے ہیں۔ قاری اس نظم کو متضاد الفاظ کے نظریہ سے پڑھتا ہے تو جب اس پر یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ یہ دو متضاد الفاظ اصل میں دو گروہ، دو جماعت ہیں (۱) عقل کی (۲) دل کی۔ دو متضاد الفاظ جب دو جماعت ٹھہرے تو ہر جماعت کا اپنا ایک نظریہ اور اپنی کچھ دلائل ہوتیں ہیں۔ قاری اس نظم کو جب اس نظریہ سے پڑھتا ہے تو اس کو دونوں جماعتوں کے درمیان مکالمہ بازی صاف طور پر نظر آتی ہے۔

قاری کی نظر جب نظم کے مجموعی الفاظ پر پڑتی ہے اس کو صاف طور پر نظر آتا ہے کہ اس نظم میں اقبال نے شعوری طور پر یا پھر لاشعوری طور پر ان الفاظ کو تین زمروں میں تقسیم کیا ہے:

۱ **متضاد الفاظ:** عقل دل، بھولے بھٹکے رہنما، زمین فلک، مظاہر باطن وغیرہ۔

۲ **مترادف الفاظ:** بھولے بھٹکے، علم معرفت، خدا جو خدا نما، شمع دیا، محفل بزم، زمان مکان، سدرہ عرش، بلند فلک وغیرہ۔

۳ **متصوفانہ الفاظ:** معرفت، مظاہر، باطن، محفل صداقت، حسن، خدا نما، دل وغیرہ۔

اس نظم کو اگر کوئی صوفی پڑھے تو وہ ضرور کہے گا کہ اقبال نے عقل و دل کی آڑ میں خیر و شر کی بات کی ہے، ابلیس اور انسان کی بات کی ہے۔ کیونکہ جب ابوالبشر آدم علیہ السلام کا جسد خاکی تیار ہوا تو خدائے واحدہ لاشریک لہ نے حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو، تو تمام مخلوق نے بالاتحاد سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔ جب پوچھا گیا کہ تم نے سجدہ کیوں نہیں کیا تو وہ عقلی دلائل دینے لگا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ''عقل'' استعارہ ہے ابلیس کا اور ''دل''، جو کہ جذبہ اور عقیدت کا مرکز ہوتا ہے وہ باقی تمام مطیع مخلوق جنہوں نے آدم کو سجدہ کیا ان کا استعارہ ہے۔

عقل و دل مباحثہ: عقل کہتی ہے:

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا

بھلے بھٹکے کی رہنما ہوں میں

ہوں زمیں پر گزر فلک پہ مرا
دیکھ تو کس قدر رسا ہوں میں
کام دنیا میں رہبری ہے مرا
مثل خضر خجستہ پا ہوں میں
ہوں مفسر کتاب ہستی کی
مظہر شان کبریا ہوں میں
بوند اک خون کی ہے تو لیکن
غیرت لعل بے بہا ہوں میں

ooo

مذکورہ بالا اشعار میں عقل اپنی بڑائی ظاہر کرتے ہوے یہ کہتی ہے کہ میں گمراہ لوگوں کی رہنمائی کرتی ہوں زمین پر رہکر فلک کی سیر کرتی ہوں اور میری رہنمائی حضرت خضر کی سی ہے۔ اور میں خدائے لاشریک کی کتاب کی مفسر ہوں اور اسکی شان وعظمت کو ظاہر کرنے والی ہوں اور میں ایسی انمول ہوں کہ میری قدر کے آگے لعل بے بہا ہیچ ہے۔اس قدر میرا مقام و مرتبہ ہے۔

جب دل نے کہا:

دل نے یہ سن کر کہا یہ سب سچ ہے
پر مجھے بھی تو دیکھ کیا ہوں میں
راز ہستی کو تو سمجھتی ہے
اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے
اور میں باطن سے آشنا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے
تو خدا جو خدا نما ہوں میں
علم کی انتہا ہے بے تابی
اس مرض کی مگر دوا ہوں میں
شمع تو محفل صداقت کی
حسن کی بزم کا دیا ہوں میں
تو زماں و مکان سے رشتہ بپا
طائر سدرہ آشنا ہوں میں
کس قدر بلندی پہ ہے مقام مرا
عرش رب جلیل کا ہوں میں

ooo

دل نے عقل کی گفتگو سن کر جواب میں کہا کہ خدا کے راز کو تو سمجھتی ہے اور میں اس خدا کو دیکھتا ہوں' دل نے عقل سے کہا کہ تمہارا کام صرف ظاہری چیز پر نظر رکھنا ہے میں اس چیز کے باطن کو جانتا ہوں اور اس کے مثبت اور منفی نتیجے سے واقف ہوں۔مزید دل نے کہا عقل کا کام صرف علم حاصل کرنا ہے لیکن اس علم کی معرفت سے میں واقف ہوں اور کہا کہ تیرا کام خدا کا رستہ ڈھونڈنا ہے لیکن میری اس خدائے بزرگ و برتر تک رسائی ہے۔اور کہا تو صرف محفل صداقت کی شمع ہے لیکن میں حسن کے بزم کا دیا ہوں۔

محفل صداقت کی وضاحت:

صداقت کے لغوی معنی سچائی اور یقین کے ہیں لیکن صوفیا کے پاس محفل صداقت سے مراد ایک بلند و بالا مقام ہے۔جس کے ان کے پاس تین الگ الگ درجہ ہیں (۱) یقین (۲) عین الیقین (۳) حق الیقین۔

یقین: کسی بھی واقعہ یا بات کی تصدیق کو یقین کہتے ہیں۔

عین الیقین : کسی بھی واقعہ یا بات کو کسی قابل بھروسہ مند شخصیت سے سنے ہوں۔

حق الیقین : کسی بھی واقعہ یا بات کو بذات خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہو۔

حسن کی وضاحت:

حسن کے لغوی معنی خوبی، عمدگی، بھلائی اور خوبصورتی کے ہیں۔لیکن حسن صوفیا کے پاس بارگاہ رب العالمین کا سب سے بلند و اعلی مقام ہے۔کیونکہ تمام خوبیوں کا مرکز ومحور اللہ ہی تو ہے۔

تو دل نے عقل سے کہا کہ تیرا مقام کچھ نہیں ہے میرا مقام اور بلندی کے کیا کہنے کہ جہاں بلندی بھی پستی نظر آتی ہے۔

آخیر شعر میں دل نے عقل کو شکست سے دو چار کرتے ہوئے کہا کہ میں رب ذوالجلال کا عرش عظیم ہوں جس پر رب ذوالجلال استوا فرماتا ہے۔اور یہ اظہر من الشمس ہے کہ خدا بندے کے دل میں رہتا ہے،اس مناسبت سے دل نے خود کو عرش الٰہی کہہ کر اپنی برتری کا جھنڈا لہرایا۔

اس نظم کے مجموعی اشعار کی تعداد پر نظر ڈالنے پر اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس نظم میں جملہ (۱۳) اشعار ہیں۔جن میں (۵) اشعار عقل کے ہیں اور باقی (۸) اشعار دل کے ہیں۔ اس اعتبار سے بھی دل کی ہی جیت ہوئی۔کیونکہ جس کے ہمنوا زائد ہوں اس کی ہی جیت ہوتی ہے۔اشعار کی اس تقسیم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عقل کے پانچ اشعار نہیں ہیں بلکہ چار ہیں۔وہ اس اعتبار سے کہ ہم اگر عقل کے پانچوں اشعار کو تفکر کے ساتھ پڑھیں تو پانچواں شعر جس میں عقل کہتی ہے کہ:

بوند اک خون کی ہے تو لیکن
غیرت لعل بے بہا ہوں میں

ooo

اس شعر میں بظاہر عقل نے خود کو لعل بے بہا اور دل کو بدبودار خون کہہ کر اپنی بڑائی اور دل کی ہجو کی ہے لیکن در باطن عقل نے دل کو خون کی بوند اور خود کو لعل بے بہا کہہکر خود اپنی شکست اور دل کی کامیابی کا اعلان کر رہی ہے۔وہ اس نظریہ سے کہ لعل میں بھی حرارت ہوتی ہے اور خون میں بھی حرارت ہوتی ہے لیکن لعل یعنی قیمتی ہیرہ اس کی حرارت انسان کو موت دیتی ہے جب کہ خون کی حرارت انسان کے زندگی کی ضامن ہوتی ہے۔اس اعتبار سے عقل نے خود اپنی برائی اور دل کی بڑائی کی ہے جس سے یہ شعر بھی دل کے حصہ میں آنے سے دل کے مجموعی (۹) اشعار ہوے۔اور یہ امر مسلم ہے کہ عقل خطا کرتی ہے اس نے وہ کیا۔

اور دل کی بڑائی اس اعتبار سے بھی ہوتی ہے کہ لفظ عقل مونث اور لفظ دل مذکر استعمال ہوتا ہے مذکر کو مونث پر فوقیت حاصل ہے۔جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ''الرجال قوامون علی النساء''

الختصر اقبال نے اس چھوٹی سی نظم میں اپنے ہنر کا جو جادو جگایا ہے۔یہ صرف انہی کا حصہ ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر نکہت جہاں
اسوسی ایٹ پروفیسر اردو، نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد-32

کلامِ اقبالؔ میں واقعۂ کربلا کی عصری معنویت

واقعۂ کربلا دنیا کا وہ عظیم ترین واقعہ ہے جو تمام عالم پر اثرانداز ہے۔ دنیا کی تمام زبانوں کے شعر وادب میں اس واقعہ کا ذکر ملتا ہے۔ بلاشبہ کربلا میں اتنے شعری افکار موجود ہیں جو دل و دماغ کو متاثر کرکے شاعری کو آفاقی بنا دیتے ہیں۔ بے شک دنیا میں سب سے بڑی شہادت حضرت امام حسینؓ کی ہے اور واقعہ کربلا شعورِ انسانی سے براہ راست تعلق رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری اور شاعر کا کربلا سے ایک گہرا ربط قائم ہوجاتا ہے۔

دین اسلام کی اہم ترین فکری بنیادیں تین ہیں۔ توحید، رسالت اور قرآن۔ فکر ونظر کے یہ تین اہم رخ اردو شاعری میں پہلی بار ہمیں علامہ اقبال کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ ہم جب ان کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس نکتہ کو بآسانی پالیتے ہیں جس میں اقبال معرفتِ حسینؓ کی منزلوں میں نظر آتے ہیں اس لیے ان کی شاعری میں کربلا اور اس کے ہیرو کی گونج جابجا ملتی ہے۔ اقبال عقیدہ توحید کی گتھیاں سلجھانے کے لیے آنحضرتؐ کی ذات گرامی کے سامنے اپنا سر جھکادیتے ہیں مگر ذات رسولؐ تک پہنچنے کے لیے وہ پہلے معرفت رسولؐ کے راستے پر گامزن ہوتے ہیں۔ جہاں ان کی فکر رسا کہتی ہے۔

یہاں قرآن اور رسولؐ ہم معنی ہوجاتے ہیں اور توحید و رسالت کے ادراک کی بنیاد قرآن فہمی قرار پاتی ہے۔ اقبال نے قرآن کے رموز واسرار کو کس سے سمجھا اس ذیل میں ان کا یہ مصرعہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔

رمز قرآں از حسین آموختیم

رموز بے خودی کے شرح نگار یوسف سلیم چشتی نے لکھا ہے کہ:

''میں نے ایک دفعہ حضرت اقبال سے دریافت کیا کہ رمز قرآں سے آپ کی کیا مراد ہے تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ تعلیمات قرآں کی روح یہ ہے کہ باطل کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر وقت سربکف رہو اور اگر ضرورت ہو تو جان دینے سے بھی دریغ مت کرو۔''

اقبال تردید باطل اور تائید حق میں سرفروشی کو تعلیمات قرآنی کی روح قرار دیتے ہیں اور یہی نکتہ انہوں نے امام حسینؓ سے سمجھا اور سیکھا۔ ان سے کے نزدیک قرآن انسان سے وفاداری کا جو مطالبہ کرتا ہے وہ خدا کے لیے ہے تخت وتاج کے لیے نہیں۔ ان کے اس نظریہ کے پس منظر میں امام حسینؓ کے کردار کی قوت نظر آتی ہے۔ چناں چہ وہ کہتے ہیں:

قافلہ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں
گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ وفرات

اس شعر میں اقبال نے زماں ومکاں کی طنابیں کھینچ لی ہیں۔روح عصراس میں سانس لیتی نظر آتی ہے۔قافلۂ حجاز کی اس استعاراتی فضامیں مستقبل میں رواں دواں ہونے والے قافلے بھی چشم تصور کونظر آتے ہیں جوایک حسینؑ کے بغیر وقت کی جابر قوتوں کے روبروسینہ سپر ہوجانے سے عاجز رہیں گے۔اقبال نے قافلۂ حجاز میں ماضی، حال اور مستقبل تینوں کولکھ دیا ہے۔اس شعر کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹرراج بہادر گوڑ نے لکھاہے کہ:

''اس شعر سے اقبال کی داخلی کشمکش اور ذہنی کرب کی ترجمانی ہوتی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ پھر کوئی حسینؑ آئے اور صاحبان ایمان کے قافلے کو بدی کی سامراجی طاقتوں کے خلاف کھڑا کردے جوان ملکوں کوتاراج کر رہی تھیں۔''

اقبال کے تمام تر شعری سرمایہ میں جواسلامی افکار ہیں اوران افکار میں اسوۂ حسینی کی جوانقلابی وفکری طاقت کارفرما ہے وہ رثائی ادب میں کربلا کی ایک نئی معنویت کے ساتھ رونما ہوئی۔ بیسویں صدی کے ربع اول میں سب سے اہم سیاسی واقعہ پہلی جنگ عظیم ہے جو1914ء میں چھڑی۔اس کے سیاسی اثرات بہت دورتک گئے۔اورملکی وعالمی سطح پرمختلف شعبہ ہائے حیات پراثرانداز ہوئے۔غلامی کی گھٹن میں آزادی اورانقلاب کی ضرورت نے واقعۂ کربلا کوایک نیا سیاسی تناظر دیاجسے اقبال نے اپنی شاعری میں ابھارا۔''روح اقبال''میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے لکھاہے کہ:

''اقبال نے اسوۂ حسینی کوآزادی اورحریت کا نصب العین اورلا الٰہ کی بنیادقرار دیاہے۔''

ان کی شاعری میں شبیر،حسینؑ اوراُسوہ حسینؑ باقاعدہ تھیم کا درجہ رکھتے ہیں۔یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستان حرم
نہایت اس کی حسینؑ، ابتداء ہے اسمٰعیل

ooo

صدق خلیل بھی ہے عشق،صبر حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر وحنین بھی ہے عشق

بال جبریل کی مختصر نظم ''فقر'' کا نقطۂ عروج بھی سرمایۂ شبیری ہی ہے:

اک فقر ہے شبیری، اس فقر میں ہے میری
میراث مسلمانی، سرمایۂ شبیری

فقر،یقین اورعشق اقبال کی شاعری کی تین اہم پہلو ہیں اوراقبال نے مختلف مقامات پرامام حسینؑ کے حوالہ سے ان کوپیش کیاہے۔اس سلسلہ میں ان کی فارسی شاعری بھی بہت اہم ہے۔ اپنی ایک فارسی نظم میں وہ مردمسلمان سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ عشق ایک راز تھا جوصحرا میں پھیل گیا۔تونہیں جانتا کہ اس نے کیسے اشتیاق کے ساتھ جان دی۔رسول ﷺ کی نظر سے دیکھ ،فقراورشہنشاہی دونوں حسینؑ کی وجدانی کیفیات کی وارث ہیں:

عشق رازے بود بر صحرا نہاد
تو ندانی جاں چہ مشتاقانہ داد
از نگاہ خواجہ بدرو حنین
فقر و سلطاں وارث جذب حسین

اُردو کلام کی طرح ان کے فارسی کلام میں بھی امام حسینؑ کی شخصیت مختلف اشعار میں نمایاں ہوئی ہے لیکن اپنی

ایک فارسی مثنوی میں جس طرح پیش کیا ہے اس کی مثال خود ان کے دوسرے اشعار میں نہیں ملتی۔ ؎

ہر کہ پیماں با ہوالموجود بست

اس مثنوی میں عقل اور عشق کی صفات کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے۔ عقل کی مکاری و عیاری پر عشق کی بے باکی اور اس کے عزم ویقین کی برتری کے اظہار کا اعلان کیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے ؎

''مومن از عشق است و عشق از مومن است''

اسی منزل پر وہ امام حسینؓ کو ''امام عاشقاں'' کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ اس سے ان کے نقطۂ نگاہ کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ موسیٰ و فرعون اور شبیر و یزید دو ایسی مخالف طاقتیں ہیں جو ہر لحہ نبرد آزما رہتی ہیں:

موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید
ایں دو قوت از حیات آید پدید

قوت شبیری حیات حق کی علامت ہے۔ امام عاشقاں نے ظلم و جور کے خلاف آواز بلند کر کے حشر تک کے لیے اپنے خون سے چمن نو ایجاد کیا ہے۔ اور بنائے لاالہٰ رکھ دی ہے۔ اقبال نے بتایا ہے کہ اگر امام کا مقصد حصول تخت وسلطنت ہوتا تو وہ یہ سفر قطعی اختیار نہ کرتے۔ ان کا عزم و حوصلہ مستحکم تھا ان کی تیغ نیام سے نکلی تو صرف حفاظت اسلام کے لیے۔ ان کے خون نے یہ حقیقت آشکار کر دی کہ مسلمان اللہ کے علاوہ کسی کا بندہ نہیں ہے اور کسی فرعون کے سامنے اپنا سر خم نہیں کرتا۔ انہوں نے ''لا'' کی تیغ سے باطل پرستوں کی رگوں کا خون کھینچ لیا اور صحرائے کربلا پر نقش الا اللہ لکھ دیا۔

نقش الا اللہ بر صحرا نوشت
سطر عنوان نجات ما نوشت

اور یہی ہمارے نجات کے عنوان کی پہلی سطر ہے۔

اقبال کی شاعری میں امام حسینؓ کی شخصیت عموماً انقلابی روح کے ساتھ نمودار ہوتی ہے۔ جب کہ امام کے والدین گرامی حضرت علیؓ و سیدۂ عالمیان کی شخصیات ان کے فکری مطالعہ کا حصہ ہیں۔ اقبال نے اپنی نظم ''سپاس جناب امیر'' میں حضرت علیؓ کو شث ''اے فاتح خیبر دل من'' کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ دختر رسول سیدۂ عالمیان پر ان کی نظم ''مریم از یک نسبت عیسیٰ عزیز'' خانوادۂ رسالت سے ان کی عقیدت کا ایک نیا رخ لیے ہوئے ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جناب مریم صرف ایک نسبت سے محترم ہیں کہ وہ حضرت عیسیٰ کی ماں ہیں۔ جناب زہراؑ کی فضیلت یہ ہے کہ آپ تین نسبتوں سے درجہ عظمت پر فائز ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ رحمۃ العالمین کی صاحبزادی ہیں دوسرے یہ کہ حضرت علیؓ کی زوجہ ہیں۔ تیسری عظمت یہ ہے کہ حسنینؓ کی ماں ہیں۔

اقبال کی شاعری کے اس جائزے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال نے واقعہ کربلا کو ایک نئی معنویت کے ساتھ پیش کیا۔ بقول رشید احمد صدیقی:

''شہادت سید الشہدا اور سانحہ کربلا کو اقبال نے جو نئی جہت، وسعت اور رفعت دی ہے وہ اردو شاعری میں ایک اہم اور گراں قدر اضافہ ہے۔ مرثیہ نگاری کی جو اہمیت ادب اور ہماری زندگی میں ہے اس کو اقبال نے ایک نئے تصور اور تجربے سے آشنا کیا اور ربط دیا اس طور پر اردو شاعری اور ادب میں مقام شبیری کی ایک نئی معنویت یا سمبل وجود میں آئی اور مقبول ہوئی اور وہ تصور جو نسبتاً محدود تھا لامحدود ہو گیا۔''

☆☆☆

محمد ارشد مبین زبیری

10-3-68/B/A گراؤنڈ فلور
پلاٹ نمبر 18، کلاسی کالونی، ہمایوں نگر، حیدرآباد-28 (تلنگانہ)

علامہ اقبالؒ کا تصوّرِ حسن و عشق

اُردو اور فارسی شاعری میں علامہ اقبال علیہ الرحمۃ ایک ایسا نام ہے جس کا اس دور میں کوئی ثانی نہیں۔ علامہ کی شاعری، ان کی فکر، ان کا فلسفہ، ان کا تصوف، تمام خیالات و افکار اسلامی نظریات پر مبنی ہیں، انہوں نے اپنے فارسی اور اردو شعری مجموعوں کے ذریعہ قوم و ملت میں ہمت و استقلال پیدا کیا۔ جہاں ملت کی کم مائیگی کا تذکرہ کیا تو وہیں اس ملت کو بے راہ روی سے نکلنے، حوصلہ و ہمت پیدا کرنے کی تلقین کی، خالق حقیقی سے ملت مظلوم کے تعلق سے شکوہ و شکایت بھی کی، اللہ رب العزت سے شکوہ کر کے خود ہی اس کا جواب بھی دیا۔ ملت کی پست حالی، ناامیدی اور کم ہمتی، تقصیر و گناہوں کا تذکرہ بھی کیا اور ان تمام خرابیوں کے تدارک کا طریقہ بھی بتایا۔ قوم کو خودی اور خود اعتمادی اور خدا اعتمادی کی طرف اُکسایا۔ اللہ اور رسول صلعم سے عشق حقیقی کا طریقہ بتایا۔ ان کے فارسی مجموعوں اسرار خودی، رموز بیخودی، پیام مشرق، زبور عجم، جاوید نامہ اور مسافر ہوں کہ اردو مجموعے بانگ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغان حجاز، ان تمام میں ہمیں یہی رنگ ملیں گے۔ ہمیں کسی مجموعے کے ذریعہ اقبال کے فلسفیانہ خیالات ملیں گے تو کسی میں ناصحانہ اور بلیغانہ اشعار ملیں گے۔ اسی طرح کسی مجموعے میں اللہ رب العزت سے عشق کا انداز ملے گا۔ کہیں تصوفانہ خیالات ملیں گے تو کہیں قوم اور ملت کو بیدار کرنے والی نظمیں، غزلیں، رباعیات و قطعات ملیں گے۔ پند و نصیحت بھی ان کے کلام میں جگہ جگہ ملے گی۔ غرض علامہ کے کلام میں زندگی کی تمام راہوں میں رہنمائی ملے گی۔ علامہ اقبال نے اپنی شاعری کو تفنن کا یا وقت گزاری کا ذریعہ نہیں بنایا۔ علامہ کی شاعری الہامی شاعری ہے، قرآن کی تفسیر ہے، حدیث کا مفہوم ہے، کوئی بے کار بات ان کی شاعری میں نہیں ملے گی۔ میں نے تمہیداً علامہ اقبال کی شاعری کی چند خصوصیتیں بیان کی ہیں۔ میں نے اپنے مضمون کا عنوان ''علامہ اقبال کا تصوّرِ حسن و عشق'' رکھا ہے، میں اس بات کی کوشش کروں گا کہ اپنے عنوان سے انصاف کر سکوں۔

علامہ اقبال نے اپنے شعری مجموعوں بانگ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغان حجاز میں اسی طرح فارسی مجموعوں میں جا بہ جا عشقِ حقیقی کا تذکرہ کیا ہے اور عشقِ حقیقی میں ڈوب کر اپنی شاعری کو معراج پر پہنچایا ہے۔ بانگ درا میں نظم ''دردِ عشق'' میں انہوں نے بتایا ہے کہ عشق سے مراد پرخلوص جذبہ ایثار و خدمت ہے۔ اس نظم کے پہلے بند میں علامہ نے اسی ایثار و خدمت کے جذبے کو ظاہر کیا ہے۔ بند کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

اے دردِ عشق! ہے گہرآب دار تو
نامحرموں میں دیکھ نہ ہو آشکار تو

پنہاں تہہ نقاب تری جلوہ گاہ ہے
ظاہر پرست محفل نو کی نگاہ ہے
آئی نئی ہوا چمن ہست و بود میں
اے دردِ عشق اب نہیں لذت نمود میں

علامہ اس نظم میں فرماتے ہیں کہ اے دردِ عشق تو ایک چمکتا ہوا موتی ہے جس کی آب و تاب کا اندازہ ہر آنکھ نہیں کرسکتی۔ جو لوگ تیری حقیقت اور اصلیت سے بیگانے ہیں،ان کے سامنے تجھے ظاہر نہ ہونا چاہیے۔ تیرے جلوے کی جگہ پردے میں چھپی ہوئی ہے اور نئے زمانے کی نگاہ پردے میں چھپی ہوئی چیزوں کا کوئی اندازہ نہیں کرسکتی۔ وہ تو صرف نمود و نمائش کو دیکھتی ہے۔ مطلب یہ کہ جن دردمندوں کو انسانیت یا قوم و ملک یا دین و مذہب کی خدمت کا سچا جذبہ عطا ہوا ہے وہ اس کی نمائش نہیں کرتے اور خدمت کے فرائض چھُپ چھُپا کر انجام دیتے ہیں۔ علامہ نے اس نظم میں بتایا کہ سچے عشق کا تقاضا یہی ہے۔ انہوں نے اپنی نظم ''دردِ عشق'' میں عشق کے درد کی مثالیں دیتے ہوئے کہا کہ بلبل کی فریاد،لالے کا داغ، شبنم کا گریہ، آنسو کا بہنا، شاعر کا شعر کہنا، بنسری کا گیت، یہ سب دردِ عشق کی مختلف صورتیں ہیں۔

بانگِ درا کی ایک اور نظم ''حسن و عشق'' میں علامہ نے حسن و عشق کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے یعنی ان دونوں کو اکٹھا کردیا ہے اور کہا ہے کہ حسن و عشق ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے۔ انہوں نے کہا کہ حسن اگر انجمن ہے تو عشق انجمن کی روشنی ہے۔ انہوں نے اس نظم میں بتایا کہ عشق کو حسن کی وجہ سے کمال حاصل کرنے کی رغبت ہوتی ہے اور حسن ہی عشق کو منزل پر پہنچاتا ہے۔ اس طرح علامہ نے حسن اور عشق کو ایک دوسرے کی ضرورت بتایا ہے۔

علامہ نے اپنے دوسرے شعری مجموعے ''بالِ جبریل کی کئی غزلوں میں اپنے معشوقِ حقیقی سے خطاب کیا ہے۔ جس میں ان کی پہلی غزل کے اشعار ملاحظہ فرمائیں کہ علامہ کس بہترین پیرائے میں معشوقِ حقیقی سے مخاطب ہیں:

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں
حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں
میری نگاہ سے خلل تیری تجلّیات میں
گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقشبند
میری فُغاں سے رُستخیز کعبہ و سومنات میں
گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ اُلجھ کے رہ گئی میرے توہّمات میں
تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کردیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

علامہ کہتے ہیں کہ عاشق کی نوائے شوق سے حریمِ ذات میں شور برپا ہوگیا جس سے لازمی طور پر بتکدۂ صفات میں بھی غلغلہ یعنی شور الامان والحفیظ بلند ہوگیا۔ اسی طرح دوسرے اشعار میں کہا ہے کہ جو شخص جمالِ ذات پر عاشق ہوتا ہے حور و فرشتہ اس کی نگاہ میں نہیں جچتے۔ اس کے برخلاف اس کی نگاہ ایسی تیز ہوجاتی ہے کہ تجلّیاتِ الٰہی میں خلل ہوجاتا ہے۔ انہوں نے اگلے شعر میں کہا کہ انسان کو عشق اتنا بلند کردیتا ہے کہ وہ کعبہ اور سومنات دونوں میں اسی کا جلوہ دیکھتا ہے۔ چوتھے شعر کا

مطلب یہ ہیکہ جب انسان پر الوہیت کا غلبہ ہوتا ہے تو اپنے وجدان کی بدولت ساری کائنات کو آن واحد میں دیکھ لیتا ہے۔اور جب اس پر مادیت کا غلبہ ہوتا ہے تو عقل سے کام لیتا ہے۔اگلے شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ انسان خدا کا راز ہے اور خدا نے انسان کو فاش کر دیا جس سے اُس کا راز ظاہر ہوگیا۔

بال جبریل کی ایک اور غزل میں علامہ اقبال نے کہا کہ میں مجسم عشق ہوں اس لئے مر کر بھی عشق میری ذات سے جدا نہیں ہوگا۔اشعار ملاحظہ فرمائیں:

پریشاں ہوکے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے
نہ کردیں مجھ کو مجبورِ نوا فردوس میں حوریں
مرا سوزِ دروں پھر گرمیٔ محفل نہ بن جائے
کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو
کھٹک سی ہے جو سینے میں غمِ منزل نہ بن جائے
بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو
یہ میری خود نگہداری مرا ساحل نہ بن جائے

اس غزل میں علامہ کہتے ہیں کہ بعد وفات اگر میرا گذر جنت میں ہوگیا تو حوریں یقیناً میری طرف ملتفت ہونگی لیکن میں عاشق صادق ہوں ان کو دیکھ کر مجھے اپنا محبوب یاد آئے گا۔اگلے شعر میں علامہ کہتے ہیں کہ محبت میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ عاشق اپنے محبوب کی تلاش میں نکلتا ہے اور جہاں اس کا محبوب قیام کرتا ہے وہ بھی اسی جگہ قیام کرتا ہے۔پھر تلاش میں آگے جاتا ہے تو چھوڑی ہوئی منزل یاد آتی ہے۔علامہ کہتے ہیں کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ کھٹک بڑھتے بڑھتے غم منزل نہ بن جائے۔اور اگر ایسا ہوگیا تو بہت برا ہوگا کیونکہ پھر منزل کے غم میں عاشق محبوب کی تلاش کے کام سے غافل ہوجائے گا۔علامہ کی اس غزل کی خوبی یہ ہے کہ اس کے ہر شعر سے عشق کی کسی نہ کسی صفت کا اظہار ہوتا ہے۔

یہاں مضمون کی طوالت کے خوف سے راقم اپنے قلم کو روک لگا رہا ہے اور اختصار کے ساتھ اس طرف اشارہ کر دینا کافی سمجھتا ہے کہ علامہ اقبال نے اپنی دوسری نظموں، غزلوں، رباعیات اور قطعات میں حسن وعشق کے باہمی ربط کو واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ عشق حقیقی یعنی اللہ اور اس کے رسول صلعم سے عشق کیسے کیا جاتا ہے۔ان کے افکار سے ہمیں لگتا ہے کہ علامہ کو ہر جگہ ہر شئے میں عشق کارفرما نظر آتا ہے۔علامہ عشق کو کائنات کی سب سے بڑی تخلیقی قوت تصور کرتے ہیں۔علامہ ایک اور غزل میں عشق کی مدح وستائش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر وبم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دمبدم
آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخِ گُل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

علامہ فرماتے ہیں کہ جس طرح زیر وبم پر راگنی کا وجود ہے اسی طرح زندگی کی دلکشی اور وجود عشق پر موقوف ہے۔اور عشق انسان کی شخصیت میں اس طرح سما جاتا ہے جس طرح شاخ گُل میں بادِ سحر گاہی کا نم۔

غرض علامہ اقبالؒ کا کلام جا بہ جا عشق اور عشق حقیقی کے جذبات سے معمور ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر عظمت اللہ
اسسٹنٹ پروفیسر آف اُردو
ناگارجنا گورنمنٹ ڈگری کالج، نلگنڈہ۔ (تلنگانہ)

اقبالؔ کا مردِ مومن

اقبالؔ کے فکر و فن میں اتنی گہرائی اس قدر وسعت اور اس درجہ ہمہ گیری ہے کہ ان کے پیغام کی تفہیم عام انسان کے بس کی بات نہیں۔ ان کی شاعری انسانیت کے شعور کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ انسانیت اور انسان دوستی کی بنیاد پر انہوں نے اپنے فکر و فن کی بنیاد استوار کی ہے۔ وہ مشرق و مغرب کے کئی فلسفیوں کے خیالات سے بھی متاثر رہے لیکن کسی ایک فلسفہ کے ساتھ بہہ نہیں گئے۔ ان کا فلسفہ صرف فلسفہ ہی نہیں حیاتِ انسانی کا ایک نظامِ فکر ہے۔

اقبالؔ کے خیالات اور افکار اسلامی نظریات اور اسلامی نظامِ حیات پر مبنی ہیں۔ لیکن ان اسلامی نظریات نے انہیں محدود نہیں کیا بلکہ ہمہ گیری، وسعت، بلندی اور مقصدِ حیات سے آگاہ کروایا۔ اسلام صرف عبادت و ریاضت کا نام نہیں ہے بلکہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو روحانی اور مادی دونوں اعتبار سے انسانیت کو منتہائے عروج پر پہنچانے کا خواہش مند ہے۔ معاشی، معاشرتی، تہذیبی اور تمدنی اقدار کی ہم آہنگی ہمیشہ ان کے پیشِ نظر رہی۔ خدا شناسی اور عشقِ نبیؐ کے آداب و اہمیت سے انسان کو آگاہ کیا۔ اقبالؔ کا مردِ مومن ایک سچا مسلمان ہے جو دراصل قرآنی نظریہ کا انسانِ کامل ہی ہے۔ اس کے پاس ایک واضح پیام ہے جس کے تحت وہ زندگی گذارتا ہے۔ زندگی کی قدریں خواہ بدل جائیں یا انسانی زندگی میں بڑا انقلاب کیوں نہ آجائے اس کے اندر نہ کوئی تبدیلی ہوتی ہے اور نہ خود وہ اپنے آپ کو بدلتا ہے۔ اس کے مثال اقبالؔ کی زبانی ملاحظہ کیجئے۔

نقطۂ پرکار حق مردِ خدا کا یقین
اور یہ عالم تمام وہم طلسم و مجاز

اقبالؔ کا بندہ مومن اللہ پر ایمان رکھتا ہے۔ وہ انبیاء کا پیغام ایمانی اصول اور اعتقادات اور واضح مقصد زندگی کا حامل ہے۔ بے مقصد زندگی کا وہ قائل نہیں وہ دنیا کے حوادث اور انقلابات سے نہیں ڈرتا بلکہ وہ عزمِ محکم رکھتا ہے اور اپنی منزل مقصود کی جانب چل پڑتا ہے۔ دنیا کے نقشہ پر کئی تہذیبیں رونما ہوئیں، بدلیں اور یہ سلسلہ باقی رہے گا لیکن اقبالؔ کے مردِ مومن کا وجود ہمیشہ باقی رہے گا۔ مولوی شمس تبریز خاں نے یوں لکھا ہے:

''اقبالؔ کا مردِ مومن زندہ جاوید ہے۔ اس لئے کہ وہ اپنے پاس ایک زندہ جاوید پیام رکھتا ہے اس کے ہونے میں ایک زندہ جاوید امانت ہے اور اس کی زندگی کی ایک زندہ جاوید

مقصد کے لئے گذرتی ہے۔''

ان کے یہاں خودی کا جو تصور ملتا ہے' تسخیر فطرت کے جو خیالات نظر آتے ہیں' انسان کامل کی جو تصویریں ابھرتی ہیں' ان سب کی تہہ میں انسان سے ان کی دلچسپی پوشیدہ ہے۔ وہ زندگی کے تقاضوں کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ وہ انسان کی عظمت کے قائل ہیں۔ انہیں اس کے صحیح منصب کا احساس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حیات وکائنات میں اس کی اہمیت کا احساس دلا کر اس کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی ایک نظم ''فرشتوں کی زبانی'' اس طرح بیان کرتے ہیں:

عطا ہوئی ہے تجھے روز وشب کی بیتابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا سیمابی
سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی ومہتابی
تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

ooo

اس کائنات کی عظیم ہستی حضرت محمدؐ کی شخصیت اور اسوۂ زندگی ہی مردمومن کی زندگی ہے۔ یہی اخلاق اور ضابطۂ حیات وہ مسلمانوں میں دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ دنیا کی سربلندی حاصل کریں اور ساری انسانیت کی فلاح وبہبودی کا ذریعہ بنیں۔ صحابہؓ نے آپؐ کے اسوۂ کو اپنایا تو اللہ نے انہیں مختلف براعظموں کی شہنشاہی عطا کی۔ اس کے برخلاف عصر حاضر کا آپ بغور جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے زوال کے کیا اسباب ہیں؟ درج ذیل اشعار میں اقبالؔ نے بندۂ مومن کے اخلاق کا تصور پیش کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

اس کی اُمیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگہہ دلنواز
نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو
رزم ہویا بزم ہو پاک دل وپاکباز

ooo

اقبالؔ وہ عظیم شاعر ہیں جن کے پاس زندگی کا ایک واضح نقطۂ نظر ہے وہ حیات وکائنات کی کسی بھی چیز کو بے کار نہیں سمجھتے تو سوچئے کہ وہ انسانی زندگی بالخصوص مردمومن کی زندگی کو بے معنی کیسے سمجھیں گے؟

ان کے مطابق مردمومن وہی ہے جس کے عزائم بلند ہوں' مقاصد جلیل ہوں وہ صرف اپنی ذات کے لئے زندگی نہ گزارے بلکہ ساری انسانیت کی کامیابی اس کی ذات کا مقصد حیات ہو۔ اقبالؔ کا مردمومن اور انسان کامل ہی مسلمان کو ستاروں سے آگے کی دنیا کی سیر کراسکتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالم رنگ و بوپر
کہ چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہین ہے پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسماں او ربھی ہیں
اسی روز وشب میں الجھ کرنہ رہ جا
کہ تیرے زماں ومکاں اور بھی ہیں

☆☆☆

اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ
17-3-224 قریشی لین
یاقوت پورہ، حیدرآباد 500 023 (تلنگانہ)

علامہ اقبال اور عشق رسول ﷺ

علامہ اقبال صرف شاعر نہیں تھے، عظیم المرتبت مفکر اور بلند پایہ فلسفی بھی تھے۔ شاعر بھی ایسے نہیں، جن کے ہاں رومان پروری اور نام نہاد عشق و عاشقی کا عنصر اس درجہ غالب ہو کہ ان کا ذہن زمینی حقائق اور سنگلاخ سچائیوں سے منہ موڑ لے، انہوں نے تو فکر وفن کی دوئی کو ایک ناقابل تقسیم اکائی میں تبدیل کر دیا تھا اور ادب برائے ادب کی تخیلاتی دنیا کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ علامہ اقبال ایسے شاعر تھے جن کے ہاں ادب وسیع تر اسلامی اور سماجی مقاصد کی تکمیل کا مستحکم ذریعہ تھا اور وہ ادب صرف انسان کی جمالیاتی حس کو ہی نہیں محظوظ کرتا تھا، بلکہ اس کے عقل و وجدان، اس کی فکر و خیال اور اس کے سماجی اور معاشرتی تصورات پر بھی ہمہ گیر اور بھرپور طور پر اثر انداز ہوتا تھا۔ اقبال جہاں بڑے شاعر تھے، وہیں اسلامی وملی درد رکھنے والے اور قومی غیرت وحمیت سے سرشار سچے اور پکے مسلمان بھی تھے۔ انھوں نے امت مسلمہ کے اجتماعی شعور کو بیدار کرنے، انھیں فراموش ماضی کی یاد دہانی کرانے اور انھیں خیر امم کے مطلوبہ منصب پر لا کھڑا کرنے کے لیے پیمبرانہ مقاصد کے تحت شاعری کے ہتھیار سے کام لیا۔ ناقدین اپنے مفروضات کی بنیاد پر خواہ کچھ بھی رائے قائم کریں، حقیقت یہ ہے کہ یہی تذکیری دوران کی شاعری کا نقطۂ عروج ثابت ہوا۔

علامہ اقبال کی تعلیم وتربیت ایسے اسلامی اور دینی ماحول میں ہوئی تھی کہ اسلام، انبیاء، صلحا، صوفیا اور علمائے کرام سے محبت ایام طفولت میں ہی ان کے خمیر میں رچ بس گئی تھی۔ حب رسول اور عشق نبوی تو ان کے شریانوں میں خون بن کر گردش کرتا تھا۔ بخاری اور مسلم کی ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ تمھارا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا، جب تک کہ میری محبت تمھارے دل میں اولاد، والدین اور پورے انسانی کنبے کی محبت سے بڑھ کر نہ ہو۔ اس حدیث کے واضح مفہوم پر ایمان رکھتے ہوئے علامہ اقبال حب نبوی اور عشق رسول کو ایمان کی بنیاد واساس تصور کرتے تھے۔ آپ ﷺ کا نام زبان مبارک پر آتے ہی یا آپ ﷺ کا نام کانوں میں پڑتے ہی احساس وشعور میں سوز وگداز کی برقی لہر دوڑ جاتی اور تفکرات کی لامحدود دنیا میں کھو جاتے تھے اور پرنم آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی تھی۔ ذکر نبوی کیا چھڑتا کہ ان کے جذبات پر رقت کی کیفیت طاری ہوئی اور وہ چند ثانیوں میں بے قابو اور بے تاب ہوگئے۔ عشق رسول، صحابۂ کرام سے محبت ان کی شاعری کا جزو اعظم تھا۔ اور عشق نبوی کی

آ گ نے غیر محبوب کے سارے تصورات کو جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔علامہ اقبال کی حضور پر نورﷺ سے والہانہ عقیدت اور محبت اتنی دو آتشہ تھی کہ پنجاب کے ایک صاحب ثروت کی شان دار کوٹھری کے مخملی اور نرم بستر ے پر اس لیے رات نہیں گزاری اور پوری رات ایک کرسی پر بیٹھ کر روتے اور سسکتے ہوئے یہ کہہ کر گزار دی کہ جس رسول پاک کی جوتیوں کے صدقے میں آج ہم کو یہ مرتبے حاصل ہوئے ہیں،اس نے بوریے پر سو کر زندگی گزار دی تھی۔ اگر چہ انھیں مدینہ منورہ اور روضۂ مطہرہ کی زیارت نصیب نہ ہو سکی،اور مقدرات خداوندی کے تحت فریضۂ حج کی ادائیگی کی سبیل موت تک نہ نکل سکی،لیکن سرزمین حجاز اور مدینہ منورہ کی زیارت کی تمنا دل کے ریشے میں اس قدر پیوست ہوگئی تھی کہ گھنٹوں روضۂ نبوی کی سنہری جالیوں کے تصور اور مکہ و مدینہ کی سنگریزوں والی وادیوں کے تخیل میں گزار دیتے تھے۔ اخیر عمر میں جب کہ شدید بیماری کے سبب اعضائے جسمانی کمزور ہو گئے تھے،یہ ایمانی آرزو اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ سید عبد الرشید فاضل علامہ اقبال کے حب نبوی اور تصور محبوب کے استغراق اور محویت کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ذات قدسی صفات سے علامہ کا تعلق اتنا مضبوط تھا کہ تصور کرتے ہی علامہ کی حالت دگرگوں ہو جاتی تھی اور میں نے خاص لوگوں سے بطور راز ضرور کہا کہ یہ اگر حضور کے مرقد مبارک پر حاضر ہوں گے تو زندہ واپس نہیں آئیں گے۔ وہیں جاں بحق ہو جائیں گے۔

محمد اقبال 9 رنومبر 1977ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے (جو اُس وقت سیالکوٹ انڈین یونی میں شامل تھا) اور ان کے دادا کشمیری تھے۔اور اقبال کے والد جناب شیخ نور محمد نام تھا اور 1930ء میں ان کا انتقال ہوا۔ وہ پیشہ کے اعتبار سے درزی تھے۔اور یہ مذہبی آدمی تھے۔اور ان کی والدہ امام بی بی جو پنجابی تھیں جو بہت ہی ہمدرد اور رحم دل عورت تھیں۔ جو غریبوں کی مدد کرتی تھیں اور ان کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔ان کا انتقال 9 نومبر 1914ء کو سیالکوٹ میں ہوا۔ محمد اقبال کو اپنی والدہ سے بہت پیار تھا۔

اقبال اردو اور فارسی میں شاعری کرتے تھے اور یہی ان کی بنیادی وجہ شہرت ہے۔شاعری میں بنیادی رجحان تصوف اور احیائے امت اسلام کی طرف تھا۔ "دا ریکنسٹرکشن آف ریلیجس تھاٹ ان اسلام" کے نام سے انگریزی میں ایک نثری کتاب بھی تحریر کی۔ علامہ اقبال کو دور جدید کا صوفی سمجھا جاتا ہے۔ بحیثیت سیاستدان ان کا سب سے نمایاں کارنامہ نظریہ پاکستان کی تشکیل ہے، جو انہوں نے 1930ء میں الہ آباد میں مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پیش کیا تھا۔ یہی نظریہ بعد میں پاکستان کے قیام کی بنیاد بنا۔ اسی وجہ سے علامہ اقبال کو پاکستان کا نظریاتی باپ سمجھا جاتا ہے۔ گو کہ انہوں نے اس نئے ملک کے قیام کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا لیکن انہیں پاکستان کے قومی شاعر کی حیثیت حاصل ہے۔

محمد اقبال کی عمر جب 4 سال کی تھی تب ان کو عربی تعلیم حاصل کرنے کے لئے مسجد میں داخلہ دلوایا گیا تھا۔ جہاں یہ مذہبی تعلیم اور قرآن شریف پڑھتے تھے۔ جہاں پر اُن کے استاد جناب سید میر حسن ان کو تعلیم دیتے تھے۔زمانہ طالبعلمی میں انھیں میر حسن جیسے استاد ملے جنہوں نے آپ کی صلاحیتوں

کو بھانپ لیا۔اوران کے اوصاف خیالات کے مطابق آپ کی صحیح رہنمائی کی۔شعروشاعری کا شوق بھی آپ کو یہیں پیدا ہوا۔ اور اس شوق کو فروغ دینے میں مولوی میر حسن کا بڑا دخل تھا۔اقبال 1893ء میں اپنی میٹرک کی تعلیم مکمل کی اوراس کے بعد 1895ء میں انٹرمیڈیٹ میں آرٹس ڈپلوما مکمل کیا اوراس کے بعدانہوں نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ حاصل کیا جہاں سے وہ بیچلر ڈگری آرٹس میں حاصل کی جو انگلش لٹریچر سے 1897ء میں اورانہوں نے خاں بہادر ایف ایس جلال الدین میڈل جو عربک کے لئے حاصل کیا اور اس کے بعدانہوں نے 1899ء میں ماسٹر ڈگری آرٹس میں اسی کالج سے حاصل کیا۔انہوں نے پنجاب یونیورسٹی میں ٹاپ کیا تھا۔

اقبال کی پہلی شادی 1895ء میں جب یہ ڈگری کالج میں زیرتعلیم تھے ہوئی۔اپنی زندگی کا آغاز علامہ اقبال نے اورینٹل کالج میں عربی کے ریڈر کی حیثیت سے کیا۔محمد اقبال کی پہلی بیوی کا نام کریم بی بی تھا جوایک فیزیشن خاں بہادر محمد خاں کی دختر تھیں اوران کے نانا خواجہ خورشید میوزیک ڈائرکٹر تھے۔ محمد اقبال کی دوسری شادی سردار بیگم سے ہوئی اوران کی تیسری شادی ممتاز بیگم سے 1914ء میں ہوئی تھی۔

محمد اقبال ماسٹر آف آرٹس کی ڈگری 1899ء میں مکمل کرنے کے بعداورینٹل کالج جونیئر پروفیسر کی حیثیت سے گورنمنٹ کالج لاہور میں کام کرنے لگے جو پہلے محمد اقبال نے اسی کالج سے اپنی تعلیم حاصل کی تھی۔اورانہوں نے 1905ء میں یہ انگلینڈ کوروانہ ہونے سے قبل اس کالج میں کام کیا۔ اور پھر 1908ء میں محمد اقبال نے ہندوستان واپس آئے۔

اور پھر دوبارہ اس کالج میں انگلش لٹریچر کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنا شروع کردیا۔اورساتھ ہی ساتھ چیف کورٹ لاہور میں وکالت کا پیشہ بھی اختیار کیا' پھر بعد میں وکالت کا پیشہ چھوڑ دیا اورانجمن حمایت اسلام کے ایک کارکن کی حیثیت سے کام کرنا شروع کردیا 1919ء میں انجمن حمایت اسلام کے جنرل سکریٹری بنائے گئے ۔اس طرح انہوں نے مذہبی اور انسانی ترقی کے لئے کام کرنا شروع کردیا۔

محمد اقبال پر مولانا رومی کی شاعری وفلسفہ کا ایسا اثر ہوا جس نے اقبال کو بدل کر رکھ دیا۔محمد اقبال کا بچپن سے ہی مذہبی ماحول تھا' انہوں نے بچپن ہی سے اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کرنا شروع کردیا تھا۔اسلامی کلچر تہذیب' تاریخ' سیاست اوران کے اس مطالعہ میں اور شاعری میں مولانا رومیؒ کی شاعری اور فلسفہ کی رہنمائی شامل رہی۔

شاعر مشرق علامہ اقبال حساس دل ودماغ کے مالک تھے۔آپ کی شاعری زندہ شاعری ہے جو ہمیشہ مسلمانوں کے لیے مشعل راہ بنی رہے گی۔یہی وجہ ہے کہ کلام اقبال دنیا کے ہر حصے میں پڑھا جاتا ہے۔اقبال نے نئی نسل میں انقلابی روح پھونکی اور اسلامی عظمت کو اجاگر کیا۔ان کے کئی کتابوں کے انگریزی، جرمنی ،فرانسیسی،چینی ، جاپانی اور دوسری زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔جس سے بیرون ملک بھی لوگ آپ کے معترف ہیں۔ بلامبالغہ علامہ اقبال ایک عظیم مفکر مانے جاتے ہیں۔اقبال کو حضورؐ سے جو والہانہ عشق ہے اس کا اظہار اس کی اردو اور فارسی کے ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔اقبال کی انفرادیت ہے کہ انہوں نے اردو فارسی دونوں زبانوں میں مدح رسول

اکرمؐ کوایک نئے اسلوب اور نئے آہنگ کے ساتھ اختیار کیا۔

اقبال کی طبیعت میں سوز و گداز اور حب رسولؐ اس قدر تھا کہ جب کبھی ذکر رسولؐ ہوتا تو آپ بے تاب ہو جاتے اور دیر تک روتے رہتے۔ روزگار فقیر میں سید وحید الدین لکھتے ہیں کہ اقبال کی شاعری کا خلاصہ جوہر اور لب لباب عشق رسولؐ اور اطاعت رسولؐ ہے۔ ان کا دل عشق رسولؐ نے گداز کر رکھا تھا زندگی کے آخری زمانے میں یہ کیفیت اس انتہا کو پہنچ گئی تھی کہ ہچکی بند جاتی۔ آواز بھرا جاتی تھی اور وہ کئی کئی منٹ سکوت اختیار کر لیتے تھے۔ تا کہ اپنے جذبات پر قابو پا سکیں۔ عشق و محبت کا یہ مرتبہ ایمان کا خلاصہ ہے۔ اتباع رسولؐ کے بغیر محبت رسولؐ ناممکن ہے۔ آپؐ کی ذات گرامی رحمتہ اللعالمین تھی۔ اس لئے مومن کو بھی رحمت و شفقت کا آئینہ ہونا چاہیے۔

مثلِ بو قید ہے غنچے میں، پریشاں ہو جا
رخت بردوش ہے ہوائے چمنستاں ہو جا
ہے تنک مایہ، تو ذری سے بیاباں ہو جا
نغمہ موج سے ہنگامہ طوفاں ہو جا
قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمد سے اجالا کر دے

عشق وہ والہانہ جذبہ ہے جو حضرت انسان کو دوسرے اقوام سے ممتاز کرتا ہے۔ یہ جذبہ بناوٹ، عیاری، امید) معشوق سے کچھ حاصل کرنے کی (۔ لالچ سے ماورا ہوتا ہے۔ یہ جذبہ انسان کو ایک جست میں اس بلندی اور آفاقیت تک لے جاتا ہے۔ جس کا ہم خیال بھی نہیں کر سکتے۔ اس قوت سے یقین و ایمان میں پختگی آتی ہے۔ اور اسی جذبہ کے تحت ایمان بالغیب پر یقین آ جاتا ہے۔ حضرت سید محمد ذوقی شاہ اپنی کتاب سرِ دلبراں میں لکھتے ہیں:

عشق ایک مقناطیسی کشش ہے جو کسی کو کسی کی جانب سے ایذا پانا، وصال سے سیر ہونا، اس کی ہستی میں اپنی ہستی کو گم کر دینا یہ سب عشق و محبت کے کرشمے ہیں:

عاشقی چیست؟ بگو بندہ جاناں بودن
دل بدست دگرے دا دن و حیراں بودن

اور جب یہ تعلق یا کشش سیدنا محمد مصطفیٰ سے ہو تو پھر کیا کہنا۔ ان کی ہستی تو ایک بحر زخار کے مانند ہے جس کی موجیں آسمان کو چھوتی ہیں۔ جس کی تعلیمات محبت، اخوت، مساوات اور رواداری کا درس دیتی ہیں۔ جو لوگوں کو حیات نو عطا کرتی ہیں۔ اس کے اخلاق کے بارے میں خود اللہ فرماتے ہیں:

''اے حبیب بے شک تو اخلاق کے بلند درجے پر ہے''۔

جن کو نبوت سے پہلے امین اور صادق کے خطاب دیے گئے۔ رشک کی بات ہے کہ اقبال کو اس عظیم بندے سے عشق تھا اور اس آفتاب کے نور سے اقبال کی شاعری منور ہے۔

می ندانی عشق و مستی از کجا ست؟
ایں شعاع افتاب مصطفیٰ ست

مولانا عبدالسلام ندوی اقبال کامل میں لکھتے ہیں:

ڈاکٹر صاحب کی شاعری محبتِ وطن اور محبت قوم سے شروع ہوتی ہے اور محبت الٰہی اور محبت رسول پر اس کا خاتمہ ہوا۔

اقبال کو حضور سے جو والہانہ عشق ہے اس کا اظہار اس کی اردو اور فارسی کے ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔ اقبال کی انفرادیت

ہے کہ انہوں نے اردو فارسی دونوں زبانوں میں مدح رسول اکرم کو ایک نئے اسلوب اور نئے آہنگ کے ساتھ اختیار کیا:

خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اس کا
خو شا وہ دور کہ دیدار عام تھا اس کا

اقبال سردار دو عالم کی سیرت پاک کا غائر مطالعہ کرنے کے اور مطالب قرانی پر عبور حاصل کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ آنحضرت کی ذاتِ بابرکات جامع الحیثیات ہے۔تمام کمالات ظاہر و باطن کی اور سرچشمہ ہے تمام مظاہر حقیقت و مجاز کا۔کلام اقبال اٹھا کر دیکھ لیں تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پیغامِ اقبال اصل میں حب رسول ہے۔کیونکہ انہی کی ذات گرامی سرچشمہ دیں ہے:

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

کلام اقبال میں عشق رسول کے اظہار میں جب شیفتگی و وارفتگی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔وہ بزرگانِ دین کا فیضانِ نظر تھا۔اس میں مکتب کی کرامت کا دخل نہیں تھا۔آپ کے کلام میں شیخ عطار، نظام الدین اولیا، حضرت مجدد الف ثانی، مولانا روم اور امام غزالی کا تذکرہ اس امر پر شاہد ہے۔اقبال ایک جگہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی تمام تر عقل اور فلسفہ دانی کو نبی کریم کے قدموں میں ڈھیر کر دیا ہے۔اقبال کے ذہن میں عشق و مستی کا اول اور آخری محور ایک ہی ہونا چاہیے اور وہ محور ہے نبی کریم کی ذات جو ذاتِ تجلیات ہے جو بقول حضرت عائشہ کہ قرآن ہی ان کے اخلاق ہیں:

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یسیں وہی طٰہٰ

اقبال اپنے عمیق مطالعے اور مبنی بر تجزیہ مشاہدے کی بنیاد پر اس نتیجے تک پہنچے تھے کہ امت مسلمہ کی زبوں حالی اور ان کی مذہبی و سماجی مشکلات کے حل کی کلید ذات نبوی اور اسوۂ رسول میں پوشیدہ ہے۔ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہمیں اس لیے دے مارا کہ ہم نے اپنے اسلاف کی میراث گنوادی۔علامہ اقبال ہر مصیبت اور پریشانی کے وقت درِ نبوی پر اپنی جبین نیاز خم کرتے ہیں۔ان کے تصور سے اپنے مشام جان کو معطر کرتے ہیں اور انھیں کے پرنور مرقد سے دستگیری کی التجا کرتے ہیں۔علامہ اقبال حضور رسالت مآب کے در دولت پر ہی اپنا دکھڑا سناتے اور اپنی بے کلی اور بے چینی کا سامان تلاش کرتے ہیں۔بانگ درا کی نظم خطاب بہ نوجوانان اسلام میں انہوں نے مسلم نوجوانوں کو انہی اسلامی خطوط پر غور و فکر کرنے اور انہیں اپنے بھولے ہوئے ماضی کو یاد کرنے کی تلقین کی ہے کہ اسی راہ سے امت مسلمہ کے درد کا مداوا کیا جا سکتا ہے اور اس کو زندگانی کی پرخار وادیوں سے بآسانی نکالا جا سکتا ہے۔علامہ اقبال عظمت رفتہ کی بازیابی اور دنیا کے منظرنامے پر اپنی موجودگی درج کرانے کے لیے حضور رسالت مآب ﷺ کے منہاج و مزاج کی پیروی اور ان کے اسوۂ حسنہ کی اتباع کو لازمی قدر قرار دیتے ہیں، کیوں کہ اسوۂ حسنہ کی مکمل اتباع اور آپ کے نقش قدم کی پیروی میں ہی دنیا اور آخرت کی یقینی کامیابی اور سرخروئی کا راز مضمر ہے، جواب شکوہ میں خدائی وعدے کی یاد دہانی کراتے ہوئے یوں نغمہ سرا ہیں:

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں کیا چیز ہے لوح و قلم تیرے ہیں

☆☆☆

سیدہ عابدہ امۃ النعیم
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، عربی و فارسی
مدراس یونیورسٹی، چینائی (ٹامل ناڈو)

شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ اور مغربی تہذیب

شاعرِ مشرق حکیم الامت علامہ ڈاکٹر محمد اقبال (9 نومبر 1877 - 21 اپریل 1938ء) اردو کے عظیم اور آفاقی شعراء میں ممتاز مقام و مرتبہ کے حامل ہیں۔ علامہ اقبال کو ''شاعرِ مشرق'' کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے۔ ان کا وژن عالمی اور آفاقی ہے۔ انہوں نے وطنی شاعری، قومی شاعری، ملّی شاعری سے آفاقی شاعری تک تدریجاً فکری ارتقاء کے مدارج طے کئے۔ اردو شاعری میں تو انہیں امتیاز اور انفرادیت حاصل ہے ہی، اس کے علاوہ عالمی ادب میں بھی ان کی مثال اور نظیر نہیں ملتی۔ فکر و فن اور مواد و ہیئت کے اعتبار سے بھی انہیں ایک نمایاں شناخت حاصل ہے۔ انہوں نے اپنے فکر و فن سے اپنے مابعد شاعروں کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔

علامہ اقبال نے انگلستان اور جرمنی میں تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے یورپ کو بغور دیکھا۔ مغربی تہذیب کا انتہائی گہرائی سے مشاہدہ کیا۔ مشرق تو ان کی نظر میں تھا ہی، لیکن مشرقی فکر کے مطالعہ اور مابعد الطبعیاتِ ایران پر تحقیق و تدقیق نے ان کے فکر و نظر میں وسعت و گہرائی پیدا کر دی۔ مغربی تہذیب سے واقفیت اور مشاہدہ نے ان کے دل و دماغ میں مشرقی تہذیب کی بلندی و برتری کے خیالات کو رسوخ عطا کیا۔ ان کی نظر میں مشرقی تہذیب و تمدن کی اہمیت و افادیت اور وقعت میں اضافہ ہوتا رہا۔

علامہ اقبالؔ نے مشہور جرمن شاعر گوئٹے کے ''دیوانِ مغربی'' کے جواب میں ''پیامِ مشرق'' لکھ کر مشرقی تہذیب کے روشن نقوش اور تہذیبی اقدار کو اس طرح پیش کیا کہ مشرق بنام مغرب ایک واضح پیغام پیش کیا۔ درحقیقت مشرق کی روشن ضمیری، مابعد الطبعیات، الٰہیات، فلسفہ، کلام اور اخلاقی اقدار مغرب سے کہیں زیادہ اپنا تاریخی تسلسل اور فلسفیانہ نظام رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے مغرب اور مغرب کی مادی تہذیب پر مشرق کی روحانیت اور اخلاقی اقدار کو مقدم جانا اور قابلِ ترجیح قرار دیا۔

ابتدائی دور کی شاعری ہی سے اقبال کے ہاں مشرقی تہذیب و تمدن اور اس کی خصوصیات کا اظہار ملتا ہے۔ انہوں نے ابتداء میں فصیح الملک داغؔ دہلوی کا تتبع کیا۔ پھر لسان العصر اکبر الہ آبادی کے ظریفانہ رنگ سے متاثر ہوئے۔ اس دور میں علامہ اقبال کے کلام میں مغربی تہذیب پر چوٹ اور طنز و تعریض کا رنگ صاف نظر آتا ہے۔ علامہ اقبال نے مغربی تہذیب اور اس کے مظاہر پر طنز، ظرافت اور مزاح کے پیرایہ میں گرفت کی ہے۔

اکبر کی پیروی میں اقبالؔ کا جو ظریفانہ کلام ہے، اس
کی یہ دو مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

ایک جگہ کہتے ہیں:

تھے وہ بھی دن کے خدمتِ استاد کے عوض
دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجیے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ "بل پیش کیجیے"!

اقبالؔ مغرب کے نظامِ حیات اور مغربی تہذیب پر کڑی گرفت کرتے ہیں۔ ان کے ہاں مغرب اور مشرق میں بُعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ یہ دونوں خطے، مشرق و مغرب دو متضاد اور متصادم اجزاء اور عناصر ترکیبی کے مظاہر ہیں۔ گویا دونوں ایک دوسرے کی نقیض اور ضد ہیں۔

مغرب کا نظام مادیت پر مبنی ہے۔ مادیت کی لہریں مغرب میں بڑے زور سے اٹھ رہی ہیں۔ علامہ اقبال نے مغربی تہذیب کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا۔ غور و خوض کے ساتھ معائنہ کرنے کے بعد علامہ نے اس تہذیب کے عروجِ ظاہری کے حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ زوالِ باطنی و روحانی کا شکار ہونے کو اظہار کیا ہے۔

علامہ اقبالؔ اپنی نظم "مغربی تہذیب" میں مغربی تہذیب کو فسادِ قلب و نظر اور اس کی مدنیت کو غیر عفیف قرار دیتے ہیں:

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیّت کی رہ نہ سکی عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیرِ پاک، خیالِ بلند و ذوقِ لطیف !!

"یوروپ اور یہود" میں مادیت کی وجہ سے اقبالؔ نے مغربی تہذیب کو حالتِ نزع کا شکار قرار دیا ہے۔ مشینی زندگی، عیش کی فراوانی، بے نور زندگی اور روحانیت سے محرومی، ان حالات کی اہم وجہ کلیسا پر یہودیوں کا تسلط اور یہودیوں کی عیاری ہے:

یہ عیش فراواں، یہ حکومت، یہ تجارت
دل سینۂ بے نور ہیں محرومِ تسلی
تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے
یہ وادیٔ ایمن نہیں شایانِ تجلی
ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیب جواں مرگ
شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولّی

یہودیوں کے سلسلے میں ایک جگہ علامہ اقبالؔ "فلسطینی عرب سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تری دوا نہ جنیوا میں ہے، نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے

مغربی تہذیب بظاہر روشن اور منور نظر آتی ہے، لیکن اس کا باطن تاریک تر ہے۔ اس کی تابناکی صرف بجلی کے دم سے ہے۔ علامہ اقبال نے تہذیبِ فرنگ کو یوں بے نقاب کیا ہے:

نہ کر افرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے
کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی براقی

(غزل- بالِ جبرئیل)

علامہ اقبال مغربی تہذیب کو مسلمانوں کے لیے موت قرار دیتے ہیں۔ علامہ نے جہاں مغرب پر تنقید کی، وہیں

مغرب زدہ مسلمانوں کو بھی اس سے دور رہنے کا پیغام دیتے ہیں؛

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت
ہے حضرتِ انساں کے لیے اس کا ثمر موت

شاعرِ مشرق نے مغرب سے صاف کہہ دیا کہ خدا کی بستی کو دوکان نہ سمجھا جائے۔ نفع ونقصان کی میزان ہر چیز کے لیے پیمانہ نہیں جا سکتی۔ انہوں نے برملا اظہار کیا کہ مغربی تہذیب وتمدن بالکل وقتی ہے، اس کو ثبات وقرار نہیں ہے۔ اس تہذیب کے خاتمہ کو قطعی قرار دیتے ہوئے انہوں نے اسے ایک ناپائیدار آشیانہ سے تشبیہہ دی:

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دوکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب آپ اپنے خنجر سے خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ بنے گا آشیانہ ناپائیدار ہو گا

اقبال مغربی تہذیب اور تہذیبِ حاضر کے مقابلے میں مسلمانوں کی معراج کو شانِ استغناء میں تلاش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلّی میں
کہ پایا میں نے استغناء میں معراجِ مسلمانی

مغربی تہذیب پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے تہذیبِ حاضر برتضمین برشعرِ فیضی میں کہتے ہیں:

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیبِ حاضر میں
بھڑک اٹھا بھبوکا بن کے مسلم کا تنِ خاکی
کیا ذرے کو جگنو دے کے تابِ مستعار اس نے
کوئی دیکھے تو شوخی آفتابِ جلوہ فرما کی
نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے
یہ رعنائی، یہ بیداری، یہ آزادی، یہ بے باکی

پھر کہتے ہیں:

حیاتِ تازہ اپنے ساتھ لائی ہے لذتیں کیا کیا
رقابت، خود فروشی، ناشکیبائی، ہوسناکی!!

اقبال کی نظم ''طلوعِ اسلام'' ایک اہم نظم ہے۔ اس میں انہوں نے انسان کی حرص و ہوس اور اس کے قتل وخون و غارت گری، تہذیبِ حاضر کی چمک دمک، خردمندانِ مغرب کی بے بسی اور ہوس مندی کا ذکر کیا ہے:

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہر یاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے

بہ اعتبارِ مجموعی اردو شاعری میں علامہ اقبالؔ ایسے شاعر ہیں جنہوں نے مغرب کو پیغام دیا اور ''پیامِ مشرق'' کا تحفہ مغرب کو پیش کیا۔ مغربی تہذیب کو بے نقاب کرنے اور اس کی حقیقت کو واشگاہ اسلوب میں پیش کرنے میں علامہ اقبالؔ منفرد وممتاز ہیں۔ موجودہ عالمی حالات کے تناظر میں کلامِ اقبال کی معنویت کہیں بڑھ جاتی ہے۔ ان کی فکر ہمیشہ دعوتِ غور وفکر دیتی ہے۔

☆☆☆